شبِ وصال
مرزا امجد بیگ

شب وصال

مرزا امجد بیگ

اپنی چال بھول جانے والے کوے کا انجام۔ اس نے ہنس کی چال چلنے کی کوشش کی تھی۔ پھر ایک چالاک ترکیب نے اسے ٹھکانے لگا دیا اور معاملہ پہنچا بیگ صاحب کے پاس۔ اس کے بعد کیا ہوا، ان صفحات میں پڑھیے۔

ایک معتبر تجزیہ نگار کے مطابق شام کے اخبارات میں شائع
ہونے والی پچاس فیصد خبریں صبح کے اخبارات سے لی گئی ہوتی ہیں۔
باقی پچاس فیصد میں غالب اکثریت مسالے دار خبروں کی ہوتی ہے
جن میں عموماً جعلی پیروں کے ہوس ناک قصے، شوبز سے متعلق خواتین
کی بے باکیاں، آشنائی اور ناشنائی کے ضمن میں ہونے والے
عبرتناک اور لرزہ خیز قتل، مختلف قسم کے ایجنٹوں کے ہاتھوں لٹنے
والے سادہ لوح لوگوں کے واقعات اور بدکاری کے اڈوں کی رہنمائی

وغیرہ شامل ہے۔ بعض اخبارات تو مادر پدر آزاد تصاویر بھی خاص اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ میں عموماً شام کے اخبارات نہیں دیکھتا البتہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ اخبارات بڑے چٹ پٹے اور سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر کہانی چونکہ شام کے اخبار کی ایک خبر سے گہرا تعلق رکھتی ہے، اس لیے میں نے آغاز میں مذکورہ اخبارات اور ان کے مزاج کا ذکر کر دیا۔ وہ اخبار اتفاق سے میرے سامنے آیا تھا اور اس کی جس خبر نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی، وہ کچھ اس طرح سے تھی۔۔۔ پنڈی بھٹیاں کا نائی، کراچی میں کمائی!

یہ سرخی بظاہر غیر دلچسپ نظر آتی ہے لیکن جب میں نے اس سے جڑی خبر کو تفصیلاً پڑھا تو صورتحال یکسر تبدیل ہوگئی۔ اس خبر کے مطابق

پنڈی بھٹیاں کا رہنے والا ایک شخص کراچی میں آ کر اپنی شخصیت تبدیل کر لیتا ہے۔ اس کا نام عبدالرشید تھا اور وہ پنڈی بھٹیاں میں شیدا نائی کے نام سے مشہور تھا۔ ''نائی'' اس کی ذات تھی۔ برسوں پہلے جب وہ کراچی آیا تو شیدا نائی سے اے۔ آر۔ بھٹی بن گیا۔ اپنے اصل نام عبدالرشید کو اس نے اے۔ آر میں بدلا اور ذات کو نائی سے بھٹی بنالیا۔

کوئی بھی ذات یا پیشہ برا نہیں ہوتا۔ اگر انسان اپنی اصل ذات اور پیشے سے منسلک رہے تو معاشرے میں اس کی شناختی برقرار رہتی ہے اور اسی میں اس کا وقار بھی ہے۔ جو لوگ اپنے ذات بدل کر دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ معزز بن جائیں گے۔ انہیں ایک روز بری طرح پچھتانا پڑتا ہے پھر ان کا حشر شیدا نائی سے مختلف نہیں ہوتا۔

کوا چاہے کچھ بھی کر لے ہنس نہیں بن سکتا اور اس کوشش میں وہ
اپنی چال بھی بھول جاتا ہے پھر ایک اس ہٹ دھرمی کا خمیازہ بھگتنا ہی
پڑتا ہے۔

تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ شیدا نامی شخص کراچی آ گیا۔ آ کر
بھنگی بن گیا اور مختلف قسم کے چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد وہ
بالآخر ریکروٹنگ ایجنٹ بن گیا۔ اس بزنس کے لیے اس نے کمرشل
ایریا میں ایک عمدہ فلیٹ حاصل کر لیا تھا جس کے ایک کمرے میں
آفس کے ساتھ اس کی رہائش بھی تھی۔ اس کا "بزنس" عروج پر تھا
کہ ایک روز اسے اس کی رہائش گاہ پر قتل کر دیا گیا۔

شام کے اخبار میں شائع ہونے والی یہ اسٹوری دیگر کہانیوں کی
طرح میرے ذہن سے محو ہو جاتی اگر میں اس کا حصہ نہ بنا ہوتا۔ جی
ہاں۔۔۔ جس شخص کو شیدا نامی کا [illegible] جا رہا تھا، حالات نے

اسے میرا مئوکل بنا دیا۔ اس طرح میں بھی اس کہانی کا ایک کردار بن گیا۔ ملزم کا نام تھا خالد بھٹی۔۔۔!

ایک روز میں اپنے آفس میں موجود تھا کہ دو افراد میرے چیمبر میں داخل ہوئے۔ ظاہر ہے، وہ اپنی باری پر اور میری سیکرٹری کے بھیجنے پر ہی مجھ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی میں جان گیا کہ وہ کراچی سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور ازاں بعد میرا یہ اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔

میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور میز کی دوسری جانب بچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ غالباً کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں۔ اگر میں غلطی نہیں

کر رہا تو آپ کا تعلق صوبہ پنجاب کے کسی ضلع سے ہے!''

ان دونوں میں سے بڑی عمر کے شخص نے اثبات میں گردن ہلائی اور بڑی رسان سے بولا ''آپ کوئی غلطی نہیں کر رہے ہیں وکیل صاحب ہمارا تعلق پنجاب کے علاقے پنڈی بھٹیاں سے ہے لیکن یہ بتائیں کہ آپ نے یہ اندازہ کس بنا پر لگایا ہے۔

میرا مطلب ہے۔ کراچی پاکستان کا ایسا شہر ہے کہ جہاں ملک بھر سے مختلف رنگ ونسل اور قومیتوں کے لوگ آ کر آباد ہوئے ہیں بلکہ بڑی تعداد میں غیر ملکیوں کی بھی یہاں رہائش پذیر ہے۔ کراچی کو ''منی پاکستان'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ ذرا سا رکا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جب کراچی میں ملک کے کونے کونے کے افراد آباد ہیں تو ہمیں دیکھ کر آپ نے کیونکر اندازہ قائم کیا کہ ہم کہیں باہر سے آئے

ہیں؟''۔

''آپ اسے میرا مشاہدہ، تجربہ یا چھٹی حس۔۔۔کچھ بھی کہہ لیں''۔میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''میں بندے کو دیکھ کر اندازہ لگالیتا ہوں۔بہرحال، بتائیں۔۔۔میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''میرا نام سردار بھٹی ہے اور یہ میرا چھوٹا بیٹا امتیاز بھٹی ہے''۔ اس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔''سچی بات یہ ہے وکیل صاحب کہ مجھے ایک مصیبت کھینچ کر آپ کے پاس لے آئی ہے اور مجھے آپ کے تعاون اور مدد کی ضرورت ہے''۔

میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا اور سوالیہ نظروں سے سردار بھٹی کو دیکھنے لگا۔

سردار کی عمر پچپن کے قریب ہو گی۔ وہ دراز قامت اور ہاتھ

پاؤں کا مضبوط شخص تھا۔ عمر کی مناسبت سے صحت بھی قابل رشک تھی۔ تاہم کن پٹیوں پر چاندی چمکنے لگی تھی۔ اس کی کاٹھی اور جسامت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یا تو وہ فن پہلوانی کا شوقین رہا تھا یا پھر اس کا تعلق پاک فوج سے تھا۔

امتیاز بھٹی کی عمر کم و بیش بیس سال تھی۔ وہ ایک میانہ قد اور دبلا پتلا نوجوان تھا۔ وہ خاصا الجھا ہوا اور کم گو دکھائی دیتا تھا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد سردار بھٹی نے بتانا شروع کیا۔

''وکیل صاحب! میں امتیاز کے ساتھ کل رات ہی کراچی پہنچا ہوں اور ہم صدر ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میرے صرف دو بیٹے ہیں۔ ایک یہ امتیاز اور دوسرا ہمیں کراچی آنا پڑا ہے۔ یہاں کی پولیس نے خالد کو قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔''

''اوہ۔۔۔!'' وہ تھما تو میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''یہ واقعہ کب کا ہے؟''

''دو۔۔۔ بلکہ تین۔۔۔ نہیں۔۔۔ چار دن پہلے کا'' سردار بھٹی نے جواب دیا۔

آپ کے بیٹے نے کس کو قتل۔۔۔ میرا مطلب ہے، اس پر کسے قتل کرنے کا الزام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس بدبخت کا نام ہے۔۔۔ شیدا نائی!'' سردار بھٹی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

یہ سن کر شام کے اخبار میں شائع ہونے والی خبر میری یادداشت میں تازہ ہوگئی۔ میں نے اضطراری لہجے میں سردار بھٹی سے پوچھا۔

''کہیں آپ اس شیدا نائی کی بات تو نہیں کر رہے جو اے۔آر۔ بھٹی کے نام کراچی میں ریکروٹنگ ایجنسی کر رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو

بیرون ملک بھیجنے کی باقاعدہ ایجنسی بنا رکھی تھی۔۔۔بھٹی اوور سیز کارپوریشن!"۔

انہوں نے چونک کر ایک دوسرے کی صورت دیکھی پھر سردار بھٹی نے سرسراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔"وکیل صاحب! کیا آپ اس کمینے مردود کو جانتے ہیں؟"۔

میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا"میں اس شخص کو محض اخباری خبر کی حد تک جانتا ہوں۔پچھلے دنوں میں نے شام کے ایک اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی۔۔۔پنڈی بھٹیاں کا نائی،کراچی میں کمائی۔ اس خبر کی تفصیل میں بتایا گیا تھا کہ عبدالرشید عرف شیدا نائی برسوں پہلے کراچی آیا اور ایک نیا نام اے۔آر۔بھٹی اختیار کر کے رہنے لگا پھر بتدریج ترقی کرتے ہوئے وہ ریکروٹنگ ایجنٹ بن گیا۔۔۔وغیرہ وغیرہ!"

''اس کو ترقی نہیں کہتے جناب!'' سردار بھٹی نے میری بات پوری ہونے سے پہلے زہر خند لہجے میں کہا۔''ہر وہ کام جس کی بنیاد جھوٹ اور فراڈ پر رکھی جائے وہ قابل مذمت ہے اور اس کا مرتکب کو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے''۔وہ ذرا رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔''واقعی۔ وہ ذلیل پنڈی بھٹیاں کا نائی تھا، اس نے کراچی میں کمائی بھی کی لیکن اس کی وجہ سے ہم خوامخواہ مصیبت میں پھنس گئے۔ خود تو مر گیا اور میرے بیٹے پر عذاب ڈال گیا''۔

سردار بھٹی اپنی وضع قطع اور رکھ رکھاؤ سے پنجاب کے کسی قصبے کا رہنے والا ضرور نظر آتا تھا لیکن میں نے ایک بات محسوس کی کہ وہ صحیح تلفظ کے ساتھ بہت اچھی اور صاف اردو بول رہا تھا۔ اس بات نے نہ صرف مجھے چونکنے پر مجبور کیا بلکہ میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''بھٹی صاحب' آپ نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟''۔

''میں صرف پرائمری تک پڑھ سکا اور یہ پرائمری انگریزوں کے زمانے کا ہے''۔اس نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔''پھر میں برٹش آرمی میں چلا گیا۔عملی زندگی ساری کی ساری آرمی میں گزری۔ ہمارے ساتھ ایک صمد بخاری ہوتے تھے جن کا تعلق لکھنو سے تھا۔ بخاری سے میری گہری دوستی تھی اسی سبب میری اردو بہتر ہو گئی۔ آرمی میں ہم اردو بولتے تھے یا پھر انگلش''۔وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''پاکستان معرض وجود میں آیا تو میں پاک آرمی میں شامل ہو گیا اور پھر پینسٹھ کی جنگ لڑنے کے بعد ریٹائر ہوا''۔

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور سوال کیا۔

''آپ کی ریٹائرمنٹ کس عہدے پر ہوئی؟''۔

''جناب! عہدے کے اعتبار سے میں لانس نائیکل تھا اور ریکوری ڈرائیور کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا''۔ اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ ''جنگ کے دوران میں فرنٹ لائن پر لڑنے والے فوجی جوانوں کو اسلحہ اور گولا بارود وغیرہ پہنچاتا تھا اور بعض اوقات تو میں نے گن اٹھا کر فائٹ بھی کی''۔

''آج کل آپ کا شغل کیا ہے۔ ریٹائرمنٹ کی زندگی خاصی بور محسوس ہوتی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا تو بوریت کا شکار ہو کر زندگی گزارنا شاید میرے لیے مشکل ہو جاتا۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''لہذا میں نے خود کو مصروف رکھنا ضروری جانا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے ادھر پنڈی بھٹیاں ہی میں مٹھائی کی ایک دکان کھول لی۔ شروع میں یہ چھوٹی سی دکان تھی لیکن گزشتہ

چند سالوں میں بڑھتے بڑھتے یہ اب ایک کشادہ اور شاندار دکان کا روپ دھار چکی ہے۔ لوگ بڑے چاؤ سے میری دکان کی مٹھائیاں لے جاتے ہیں۔ میری زندگی میں کوئی جھمیلا، کوئی پریشانی نہیں۔ بس ایک خلش ہے۔"

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا "کیسی خلش؟"

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ میری شدت سے یہ خواہش تھی کہ میرے بیٹوں میں سے کوئی ایک ضرور فوج میں جائے لیکن افسوس کہ میری یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

امتیاز کو تو کسی بھی قسم کی فورس جوائن کرنے کا قطعاً شوق نہیں۔ خالد کو پولیس میں جانے کا جنون تھا۔ اس کے ماموں نے اس سلسلے میں کوشش بھی کی لیکن ہاں خیر، چھوڑیں اس قصے کو ورنہ ایک نئی کہانی شروع ہو جائے گی!

''وہ بات کو جلدی سے سمیٹ کر خاموش ہو گیا''۔

میں نے بھی اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔

''بھٹی صاحب! آپ کے بیٹے خالد بھٹی کو چار دن پہلے اے۔ آر۔ بھٹی یعنی شیدا نائی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا وہ کراچی گھومنے آیا تھا یا مستقل طور پر یہاں رہ رہا تھا؟''

سردار بھٹی نے جواب دیا۔ ہماری معلومات کے مطابق تو وہ پچھلے ایک سال سے سعودی عرب میں تھا۔

اس کی گرفتاری کے بعد ہمیں پتا چلا کہ وہ گزشتہ کچھ دنوں سے کراچی میں تھا۔

''یہ ایک الجھی ہوئی صورتحال ہے''۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے بیٹے کی رہائی کے لیے
آپ کا ساتھ دوں تو آپ پوری تفصیل سے مجھے آگاہ کریں“۔

وہ چند لمحے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا! ”وکیل صاحب! یہ ایک طویل اور دکھ بھرا قصہ ہے کہ خالد سعودی عرب کیوں گیا تھا۔ چونکہ موجودہ واقعے سے اس کا کوئی تعلق نہیں لہذا اس تفصیل میں جا کر خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔“

چار روز پہلے جب خالد کو فہیم دانی کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا اور اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی

میں دو دن پہلے یہاں کی پولیس نے وہاں کی پولیس سے اور وہاں کی
پولیس نے ہم سے رابطہ کیا چنانچہ میں پہلی فرصت میں کراچی چلا
آیا۔ میں نے رات ہی متعلقہ تھانے جا کر خالد سے ملاقات بھی کی۔
اس کی زبانی تازہ ترین حالات کے بارے میں مجھے جو پتا چلا وہ میں
آپ کو بتا دیتا ہوں، باقی تفصیل آپ اس سے مل کر معلوم کر لیجئے گا۔

وہ چند ثانیے خاموش رہا پھر ایک مضمحل سی سانس خارج کی اور
بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''خالد کے مطابق لگ بھگ ایک ماہ
پہلے وہ سعودی عرب سے واپس پاکستان یعنی کراچی آ گیا تھا۔ وہاں
کسی بات پر اپنے کفیل سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات زبانی کلامی
لڑائی سے ہاتھا پائی پر آئی جس کے نتیجے میں خالد کو جبراً ڈی پورٹ کر
دیا گیا''۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''بہر حال۔۔۔آپ خالد کے بارے میں مزید بتائیں؟''۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔وکیل صاحب! خالد نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اپنے اس طرح واپس آنے پر سخت پریشان تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ پنڈی بھٹیاں آ کر ہمیں صورت حال سے آگاہ کرے۔

لہذا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کراچی ہی میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کرے گا۔ یہ اس کا ایک جذباتی فیصلہ تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اسے سیدھا ہمارے پاس آنا چاہیے تھا۔ہمیں اس کے حالات جان کر افسوس ضرور ہوتا لیکن وہ اس مصیبت سے دوچار نہ ہوتا۔ بہر حال، کیا کیا جا سکتا ہے۔ ہونے والی بات تو آخر ہو کر ہی رہتی ہے۔اس نے ذرا خاموشی اختیار کر کے ایک بوجھل سانس ارج کی اور سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''خالد کی وطن واپسی کوئی ایک پہلے ہوئی۔ وہ سعودیہ سے تقریباً
لٹ پٹ کر آیا تھا تاہم اس کی جیب میں تھوڑی سی رقم موجود تھی۔
نوکری کی تلاش میں جیب بڑی تیزی سے خالی ہوتی جا رہی تھی۔
نوکری تو نہ ملی مگر ایک روز اسے شیدا نائی نظر آ گیا۔ خالد نے اسے پہلی
نگاہ میں پہچان لیا حالانکہ شیدا نائی نے خود کو بالکل ہی بدل ڈالا تھا۔ وہ
شیدا نائی جو پنڈی بھٹیاں کی ایک چھوٹی سی دکان پر بیٹھا استرے کو
پتھر پر گھستا رہتا تھا، گاؤں کے لوگوں کی داڑھیاں مونڈتا' حجامت بناتا
اور شادی بیاہ وغیرہ میں دیگیں پکایا کرتا تھا۔۔۔اب شہری بابو نظر آ رہا
تھا۔ خالد کو یہ تو پتا تھا کہ برسوں پہلے شیدا نائی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر
پنڈی بھٹیاں سے غائب ہو گیا تھا۔

سردار حبشی نے اتنا بتانے کے بعد میری طرف دیکھا اور
پوچھا۔''وکیل صاحب! آپ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو

رہے؟''۔

''بالکل نہیں بھٹی صاحب!'' اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا اور بتانے لگا۔ ''جب خالد بھٹی اور شیدا نائی کا آمنا سامنا ہوا تو خالد نے اس کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی بڑی واضح رمک دیکھی لیکن جب خالد گرم جوشی سے اس کی جانب بڑھا تو شیدے نے بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور اس نے خالد کو بتایا کہ اس کا نام اے۔آر۔بھٹی ہے۔۔اور وہ کسی شیدا نائی کو نہیں جانتا۔ یہ کہتے ہی وہ تیزی سے مڑا اور ہجوم میں گم ہو گیا۔''

سردار بھٹی سانس ہموار کرنے کے لیے پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ شیدا نائی کا خیال تھا کہ اس نے خود کو ہجوم میں گم کر لیا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ خالد نے ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نگاہ سے

اوجھل نہیں ہونے دیا اور تعاقب کر کے اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔
تب خالد کو پتا چلا کہ شیدا نائی اپنی ذات تبدیل کر کے اے۔ آر۔ بھٹی
بن گیا ہے اور کراچی کے ایک معروف کاروباری علاقے میں ''بھٹی
اوورسیز کارپوریشن'' کے نام سے ایک ریکروٹنگ ایجنسی چلا رہا ہے۔
خالد نے یہ پتا بھی لگا لیا تھا کہ شیدا نائی کی رہائش بھی اسی فلیٹ میں
ہے جس کے ایک کمرے کو اس نے آفس بنا رکھا ہے''۔

سردار بھٹی نے ایک مرتبہ پھر توقف کیا اور اپنے بیان کو اختتام کی
طرف لاتے ہوئے بتانے لگا۔

''رات کو خالد اس سے ملنے پہنچا تو ان دونوں میں خاصی طویل
گفتگو ہوئی جس میں خالد نے بڑے واضح الفاظ میں شیدا نائی کو بتایا
کہ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ نائی سے بھٹی بن گیا ہے۔
کیونکہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ تو اس سے صرف اتنا چاہتا ہے کہ

اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لیے وہ اس کی مدد کرے۔

خالد نے شیدا نائی کو اپنے سعودی عرب سے واپس آنے کی مصیبت بھری کہانی بھی سنائی اور اس سے تعاون کی اپیل کی۔ اس کی خواہش تھی کہ شیدا نائی اپنے اثر ورسوخ سے اسے کہیں کوئی نوکری وغیرہ دلا دے۔

شیدا نائی ریکروٹنگ کی لائن میں رہتے ہوئے بڑا کائیاں اور چلتا پرزہ بن چکا تھا۔ بھانت بھانت کے چکر بازوں سے اس کا واسطہ رہتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال آیا ہوگا کہ جب تک خالد کراچی میں رہے گا، اس کے سر پر تلوار سی لٹکتی رہے گی اور اگر وہ کبھی پنڈی بھٹیاں جاتا ہے تو بھی اس کا راز منکشف ہو جائے گا۔ اس نے فوری طور پر خالد کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر اور بڑی ہوشیاری سے بولا۔

''یار خالد۔۔۔ تمہیں ادھر ادھر کہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت

''یہ مجھے پتا نہیں ہو گا یار۔۔۔!'' شیدا نائی بڑے عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ''میں لوگوں کو سعودی عرب، مسقط، بحرین، کویت اور عراق بھیجتا ہوں۔ میں ان ملکوں کے حالات اور وہاں جا کر کام کرنے والوں کے معاملات سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' وہ بڑے ڈرامائی انداز میں رک کر پھر گہری سنجیدگی سے بولا ''دیکھو خالد! میں تمہارے کام تو آ رہا ہوں لیکن اس سلسلے میں میری ایک شرط ہے!''

خالد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیسی شرط!''

''زبان بندی۔۔۔ کیا مطلب؟'' خالد نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

شیدا نائی بہ دستور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تم میرے ماضی کے بارے میں کبھی کسی کے سامنے زبان نہیں کھولو گے، اس بات کا تمہیں

وعدہ کرنا ہوگا!"

خالد نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔"یار! میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں کہ جس تھالی میں کھاؤں، اسی کو چھید نے نے بیٹھ جاؤں۔

تمہارا یہ راز آخری سانس تک یہاں دفن رہے گا'' بات ختم کرتے ہی خالد نے اپنا سینہ ٹھونکا۔

شیدانائی نے چاچا کی سے کہا''میری یہ فرمائش صرف کراچی ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ جب کبھی تم پنڈی بھٹیاں جاؤ تو بھی تمہاری زبان بند ہی رہے''۔

''اس سلسلے میں تم بالکل بے فکر ہو جاؤ''۔ خالد نے اسے یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''اول تو میرا پنڈی بھٹیاں جانے

کا ارادہ ہی نہیں اور اگر کبھی ایسا پروگرام بن بھی گیا تو میں تم سے کیے گئے وعدے کا پاس رکھوں گا“۔

شیدانائی مطمئن ہو گیا۔ اسی روز سے خالد اس کے فلیٹ میں رہنے لگا اور کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ شیدانائی بظاہر تو مطمئن ہو گیا تھا لیکن خالد نے مجھے بتایا ہے، اسے لگتا تھا کہ شیدانائی کا اطمینان اداکاری سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس دوران ایک دو ناخوشگوار اور عجیب سے واقعات بھی رونما ہوئے جن کی تفصیلات آپ کو خالد ہی بتائے گا۔

بہر حال۔۔۔آٹھ نومبر کی رات شیدانائی کو کسی نے اس کی خواب گاہ میں قتل کر دیا اور خالد کو پولیس نے اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔۔۔یہ ہے ساری کہانی وکیل صاحب۔

”آٹھ نومبر کی رات۔۔۔“ میں نے پر سوچ انداز میں

کہا۔ ’’آج تیرہ نومبر ہے۔ اس کا مطلب ہے، خالد کا ریمانڈ بھی اب تک آدھا گزر چکا ہوگا‘‘۔

’’جی ہاں، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔‘‘ سردار بھٹی نے تائیدی انداز میں کہا۔ ’’آنے والے پیر کو پولیس۔۔۔ چالان عدالت میں پیش کر دے گی‘‘۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے رف پیڈ پر اہم نوٹس لیتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ’’میں آج ہی۔۔۔ یا کل کسی وقت خالد بھٹی سے ملتا ہوں۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تازہ ترین حالات و واقعات کے بارے میں وہی صحیح طور پر مجھے بتا سکے گا۔ وہ اس وقت کس تھانہ میں ہے؟‘‘۔

سردار بھٹی نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا۔

میں نے فیس کے معاملات طے کیے۔ سردار بھٹی پنڈی بھٹیاں

سے آگے ہوئے اچھی خاصی رقم ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس نے فوراً
میری فیس ادا کر دی۔ میں نے اسے فیس ادا کر دی۔ میں نے اسے
فیس کی وصولی کی رسید دی اور پوچھا۔
''بھٹی صاحب! کیا آپ کو کسی نے خاص طور پر میرے پاس
بھیجا ہے یا یہ اتفاق ہے کہ آپ اس بلڈنگ میں واقع بہت سے
وکیلوں کے دفاتر سے سامنے سے ہو کر مجھ تک پہنچے ہیں؟''۔

''یہ ہے تو اتفاق ہی لیکن ذرا دوسری قسم کا''۔ اس نے جواب
دیا۔
میں نے پوچھا۔ ''اس دوسری قسم کی تفصیل کیا ہے؟''۔
اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''وہ جناب! بات دراصل
یہ ہے کہ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہیں وہیں پر لاہور کا رہنے والا ایک
مسافر بھی رکا ہوا تھا۔ اس بھلے آدمی کا نام ایم۔ اے۔ قریشی ہے۔

لاہور میں اس کا پبلشنگ وغیرہ کا بزنس ہے اور کاروباری سلسلے میں وہ کراچی آیا ہوا تھا۔ کل رات ہی ٹی وی روم میں ہماری ملاقات ہوئی اور قریشی صاحب نے ہماری مصیبت کا سن کر آپ کے بارے میں بتایا۔ وہ آپ کے دفتر کا ایڈریس تو نہیں جانتا تھا۔ بس اسے اتنا پتا کہ سٹی کورٹ کے قریب ہی کسی عمارت میں آپ کا آفس ہے۔ بہر حال ہم پوچھتے پاچھتے آپ تک پہنچ گئے ہیں''۔

اس زمانے میں صدر کے چھوٹے اور متوسط ہوٹلوں کے کمروں میں ٹی وی کی سہولت موجود نہیں تھی۔ ایک بڑے ہال نما کمرے کو ٹی وی روم بنا دیا جاتا تھا جہاں مسافر مختلف پروگرامز سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ ہال نما کمرا۔ بہ یک وقت تین قسم کی سہولیات فراہم کرتا تھا۔ نمبر ایک، استقبالیہ۔ نمبر دو، ویٹنگ روم۔ نمبر تین، ٹی وی روم۔ گویا وہ زمانہ آج کے زمانے سے چار ہاتھ آگے تھا جب تو ان

ون کے بجائے تھری ان ون کا راج عام تھا۔۔۔یہ الگ بات ہے کہ اس اصطلاح کو استعمال نہیں کیا جاتا تھا!

میں نے سردار بھٹی سے پوچھا ''آپ نے مقتول شیدا نائی عرف اے۔ آر۔ بھٹی کی فیملی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کیا پنڈی بھٹیاں سے اس کی فیملی کے لوگوں کو بھی یہاں بلایا گیا ہے؟''۔

''وہاں پنڈی بھٹیاں میں اس کا صرف ایک چاچا تھا رحمو نائی''۔ سردار بھٹی نے جواب دیا۔ ''ماں باپ کی وفات کے بعد شیدا نائی قصبے سے غائب ہو گیا تھا اور اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا۔ پولیس والوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے رحمو نائی کو کراچی بلایا ہے لیکن جب میں نے کہا کہ مجھے رحمو سے ملوایا جائے تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔''

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پولیس والے غلط بیانی سے کام لے

رہے ہیں۔ کیونکہ اگر رحمو کے لیے بلاوا گیا ہوتا تو یہ بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر میں بھی تو وہیں سے آیا ہوں۔ ہمیں جو اطلاع پہنچائی گئی تھی، وہ یہ تھی کہ خالد نے وہاں کراچی میں کسی کو قتل کر دیا ہے۔ مقتول کا نام اے۔ آر۔ بھٹی بتایا گیا تھا۔ یہ تو یہاں آ کر پتا چلا کہ مقتول کوئی اور نہیں بلکہ پنڈی بھٹیاں کا گمشدہ شیدا نائی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس نے مقتول کے بارے میں خالد سے جو پوچھ گچھ کی ہے، اس کی روشنی میں وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رحمو نائی کو پنڈی بھٹیاں سے بلایا ہی نہیں گیا۔۔۔ اور اگر واقعی اسے کراچی بلایا گیا ہے تو پھر وہ ابھی تک یہاں پہنچا نہیں ہے ورنہ وہ مجھ سے ضرور ملوا دیتے!''۔

''اگر پولیس دانستہ ایسا کر رہی ہے تو اس کے پیچھے ان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں پیشانی سہلاتے ہوئے

کہا۔

''مقصد میں بڑی اچھی طرح سمجھ چکا ہوں وکیل صاحب!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''وہ لوگ سودے بازی کے چکر میں ہیں''۔

''کیسی سودے بازی؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ مجھے بے وقوف بنا کر تگڑی رقم بٹورنے کے چکر میں ہیں''۔

''ذرا تفصیل سے بتائیں'' میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

سردار بھٹی بہ دستور معنی خیز انداز میں بتانے لگا۔

''پولیس کے ایک ذمے دار اہلکار نے بڑے خفیہ انداز میں مجھے پیش کش کی ہے کہ اگر میں پچاس ہزار روپے کا بندوبست کرلوں تو میرے بیٹے کے سر پر آئی بلا ٹل سکتی ہے''۔ وہ ایک لمحے کے لیے سانس درست کرنے کو رکا اور گویا ہوا۔

''پولیس کے مطابق رحمو نائی ایک لالچی شخص ہے۔ اس کو کچھ دے دلا کر خاموش کیا جا سکتا ہے۔ باقی رقم سے پولیس کی خدمت ہو جائے گی جس کے بدلے میں وہ کسی کو توڑ مروڑ کر اتنا پیچیدہ اور کمزور کر دیں گے کہ کوئی بھی وکیل بڑی آسانی سے خالد کو دو چار پیشیوں میں بری کروا لے گا''۔

''پھر آپ نے پولیس والوں کی پیش کش کے جواب میں کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اگرچہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن انہیں پتا نہیں میں نے زندگی کن کن دشتوں کی سیاحی میں گزاری ہے۔ میں ایک لمحے میں ان کی چال کو سمجھ گیا اور ان سے کہا کہ وہ مجھے رحمو نائی سے ملوا دیں۔ میں خود اس سے معاملات طے کر لیتا ہوں۔ اور یہ میرا وعدہ ہے کہ میں دین کی رقم میں سے پولیس کا حصہ ضرور

نکالوں گا۔ میری یہ بات سن کر وہ بدک گئے اور خاصی خفگی سے کہا کہ مجھے اپنے بیٹے سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، کورٹ ہی میں ہوگا اور۔۔۔ وہ اچھا نہیں ہوگا۔

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ پولیس کے ہاتھ میں کوئی رقم نہیں دی''۔اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

''ورنہ اس قسم کے معاملات میں دی جانے والی رقم اکثر کھوہ کھاتے ہی میں چلی جاتی ہے''۔

''جانتا ہوں وکیل صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''زندگی کا بیشتر حصہ برٹش آرمی میں گزارا ہے اور ایک پولیس کا بہنوئی بھی ہوں۔ خالد کا ماموں طفیل بھٹی بھی اسی محکمے سے

وابستہ رہا ہے، آج کل وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے‘‘۔

میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔’’ بھٹی صاحب! پولیس کے چالان پیش کرنے میں زیادہ دن باقی نہیں ہیں۔ جب تک تو آپ کراچی ہی میں مقیم رہیں۔ میں آنے والی پیشی پر آپ کے بیٹے کی ضمانت کروانے کی پوری کوشش کروں گا۔اور فرض کریں، اگر ایسا نہ ہوسکا تو پھر آپ واپس پنڈی بھٹیاں چلے جائیں اور رحمونائی سے مل کر صورت حال جاننے کی کوشش کریں۔ انشاءاللہ! آج یا کل خالد سے ملاقات کرتا ہوں۔ تازہ ترین حالات کے بارے میں وہی مجھے بتا سکے گا‘‘۔

سردار بھٹی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔’’ وکیل صاحب! رحمونائی کو تو ڈالیں کھڈے میں۔ مجھے اس آدمی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ وہ اگر سامنے آجاتا تو دیکھا جائے گا ورنہ اس بات سے کوئی فرق نہیں

پڑتا کہ پولیس نے اسے کراچی بلوالیا ہے یا ابھی تک وہ ادھر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ اگر وہ واقعی اس کیس کا مدعی ہے تو اسے کراچی میں موجود ہونا چاہیے جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ آئندہ پیشی پر عدالت میں نظر آئے گا“۔

اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

وکیل صاحب! یہ کیس میں نے آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ اب آپ جانیں اور یہ کیس۔۔۔ مجھے تو یہ بتائیں کہ اس معاملے میں کتنا خرچ ہوگا، میں آپ کو ایک قدم بھی پیچھے ہٹتا نظر نہیں آؤں گا۔ جب تک یہ کیس کوئی تسلی بخش صورت حال اختیار نہیں کر لیتا، میں واپس جانے والا نہیں ہوں البتہ۔۔۔ آئندہ پیشی کے بعد میں امتیاز بھٹی کو دو چار دن کے لیے ضرور پنڈی بھٹیاں روانہ کروں گا تا کہ طفیل بھٹی کی صورت حال سے آگاہ کیا جا سکے۔

میرا سالا طفیل جوڑوں کے درد میں مبتلا ہے اور موسم سرما میں اس کی تکلیف اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ بستر کا ہو کر رہ جاتا ہے اس کی بڑی خواہش تھی کہ میرے ساتھ کراچی آتا لیکن جوڑوں کی سوجن نے اسے مجبور کر دیا۔

''ٹھیک ہے بھٹی صاحب! آپ خالد کی طرف سے تو بے فکر ہو جائیں''۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اور اپنے سالے طفیل بھٹی کی جانب سے بھی!''۔

''طفیل کی جانب سے۔۔۔'' اس نے حیرت سے میری سمت دیکھا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟''۔

''میں سمجھاتا ہوں''۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس ایک دیسی نسخہ ہے۔ اگر طفیل بھٹی اس نسخے کے مطابق عمل کرے تو جوڑوں کے درد سے اسے نجات مل جائے گی''۔

''وکیل صاحب! دیسی نسخہ اور آپ کے پاس!'' اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''میرا براہ راست تو حکمت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی خاص دلچسپی ہے۔ البتہ میری والدہ کے ایک ماموں زاد بھائی مرحوم مرزا وارث بیگ بڑے پائے کے حکیم تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو یہ نسخہ بتایا تھا۔ وہ ہمارا نوجوانی کا زمانہ تھا۔ والد صاحب کو بھی ٹخنوں کے ورم کی شکایت تھی۔ انگریزی دوائیں سب ناکام ہو گئی تھیں، بس اسی نسخے سے آرام ملتا تھا''۔

سردار بھٹی نے کہا۔''وکیل صاحب! اگر آپ ہو نسخہ مجھے عنایت کر دیں تو مہربانی ہو گی''۔

''ضرور۔۔۔کیوں نہیں''۔ میں نے جلدی سے کہا۔''یہ تو نیک

کام ہے۔ اگر اس نسخے کے استعمال سے کسی کا بھلا ہو جاتا تو مجھے اس کی بڑی خوشی ہوگی"۔

پھر میں نے مذکورہ نسخہ لکھ کر سردار بھٹی کے حوالے کیا اور ترکیب بھی سمجھا دی۔ جوڑوں اور پٹھوں کو کوئی خطرناک موچ ہو یا سوجن ورم وغیرہ۔۔۔ یہ نسخہ سب کے لیے یکساں مفید اور موثر ہے۔ آماہلدی اور چوٹ بجی ایک ایک چھٹانک لے کر پیس لیں۔ جب یہ سفوف کی شکل اختیار کر لے تو انہیں الگ الگ شیشیوں میں ڈال کر ٹائٹ ڈھکن لگا دیں۔

جسم کے متاثرہ حصے کو پندرہ منٹ تک قابل برداشت گرم پانی میں ڈبو کر رکھیں پھر باہر نکال کر کسی کپڑے سے خشک کر لیں۔ متاثر حصے کی مناسبت سے دونوں سفوف کی ہم وزن مقدار پانی میں ڈال کر پکالیں تاکہ یہ لیپ کی شکل اختیار کر لے۔ اس لیپ کو متاثرہ حصے پر

لگائیں اور لیپ کے اوپر ارنڈی کا پتا رکھیں پھر اس کے اوپر روئی وغیرہ رکھ کر گرم پٹی باندھ دیں۔

یہ عمل روزانہ ایک مرتبہ کریں۔ تین سے پانچ روز کے اندر حیرت انگیز اور شاندار شفا حاصل ہوگی۔ تکلیف کے دنوں میں بڑے جانور کے گوشت کا پرہیز بھی ضروری ہے۔

سردار بھٹی اور اس کے بیٹے امتیاز بھٹی نے میرا شکریہ ادا کیا اور گرم جوش مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔

آئندہ پیشی پر پولیس نے اس کیس کا چالان پیش کر دیا۔

اس دوران میں تھانے میں ملزم خالد بھٹی سے ایک ملاقات کر چکا تھا اور اس ملاقات کے نتیجے میں ہی اہم معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران مناسب مقامات پر گاہے بہ گاہے کیا جائے گا تاکہ کہانی میں تجسس کا عنصر اور دلچسپی کا پہلو برقرار رہے جو ان صفحات پر پیش کی جانے والی کتھاؤں کا خاصہ ہے۔

میں نے اس پیشی پر اپنے وکالت نامے کے ساتھ ملزم کی

درخواست ضمانت بھی دائر کر دی تھی۔ جج کی آمد کے بعد عدالتی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ وکیل استغاثہ نے ایک طویل تقریر کی صورت میں درخواست ضمانت کے خلاف دلائل دیتے ہوئے عدالت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ کیس کے ابتدائی مرحلے پر ملزم کو رہا کرنے سے مقدمے میں پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں۔

استغاثہ کے پاس ایسے شواہد اور ثبوت موجود ہیں جن کی روشنی میں ملزم خالد کو بہ آسانی مجرم ثابت کیا جا سکتا ہے اور معزز عدالت سے پر زور اپیل کی کہ ملزم کو جیوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے تا کہ عدالتی عمل کو آگے بڑھایا جا سکے۔

میں نے خالد بھٹی سے جو تفصیلی ملاقات کی تھی، اس میں بعض ایسے پوائنٹ سامنے آئے تھے جن کی بنا پر ملزم کو باعزت بری کروایا جا سکتا تھا لیکن ان پوائنٹس کے استعمال کے لیے عدالتی کارروائی کے

دوران مناسب مواقع کے انتظار کی ضرورت تھی۔ تاہم اس کے باوجود میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کرانے کی پوری کوشش کی لیکن یہ کوشش ناکام ہوئی تھی اور عدالت نے ملزم کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجتے ہوئے دس دن بعد کی تاریخ دی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول شیدانی کی موت آٹھ نومبر کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اسے سائیلنسر لگے ریوالور کی مدد سے اس کی خوابگاہ میں قتل کیا گیا تھا۔ مذکورہ ریوالور کی دو گولیاں مقتول کی کھوپڑی میں اتریں اور اسے اس دنیا سے اس دنیا میں لے گئیں۔

استغاثہ کی رپورٹ میں بڑی تفصیل سے یہ ذکر کیا گیا تھا کہ ملزم سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مقتول کے قریب ہوا تھا۔ ملزم کی سعودیہ سے ناخوشگوار واپسی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا کہ

کچھ عرصہ پہلے جب ملزم نے مقتول کو بدلی ہوئی شخصیت کے ساتھ کراچی میں دیکھا تو اس کے عیار ذہن نے فوراً ایک سازش تیار کر لی۔۔۔مقتول کو بلیک میل کرنے کی سازش۔ وہ سمجھ گیا کہ مقتول نے خود کو ''بدلنے'' کے بعد بہت ترقی کی ہے اور بڑا آسودہ حال ہو گیا ہے۔

پنڈی بھٹیاں کا ایک معمولی سا نائی جس کی زندگی پتھر اور کچے چمڑے کے ٹکڑے پر استرا گھستے گزری تھی، وہ لکھ پتی بن کر سوٹ بوٹ میں گھوم رہا تھا جبکہ بقول ملزم ولٹ پٹ کر سعودی عرب سے آیا تھا۔ احساس محرومی اور نامساعد حالات نے ملزم کو یہ راہ سجھائی کہ اگر وہ مقتول کو بلیک میل کرنا شروع کر دے تو اس کے تمام معاشی مسائل حل ہو جائیں گے۔

اگر وہ مقتول کی اصلیت اور اوقات کو منظر عام پر لے آئے تو یقیناً

مقتول کی ساکھ اور کاروبار کو بڑا شدید دھچکا پہنچ سکتا ہے۔ اس نے مقتول سے تفصیلی ملاقات کی اور اسے شخصیت کی تبدیلی کے حوالے سے ڈرانے کی کوشش کی۔ مقتول نے صورتِ حال کی نزاکت کو فوراً بھانپ لیا۔ اس طرح ملزم کی چال کامیاب ہوگئی۔

ملزم نے زبان بندی کے وعدے پر مقتول سے سودے بازی کی۔ مقتول اس بات کے لیے راضی ہوگیا کہ ملزم اس کے ساتھ ہی قیام کرلے۔ اس کے علاوہ اس نے ملزم کو ہر ماہ ایک معقول رقم دینے کی ہامی بھی بھر لی۔ مقتول کے فلیٹ پر، قیام کے دوران چند ہی دن میں ملزم کو مقتول کی آمدنی کا اندازہ ہوگیا۔ مقتول پر تو گویا بن برس رہا تھا۔ وہ کسی شخص کو ملک سے باہر بھجوانے کے بیس ہزار روپے وصول کرتا تھا اور ہفتے میں ایک دو بندے تو اس کے چنگل میں پھنس ہی جاتے تھے۔

اگر ہفتے کا کم از کم ایک آدمی بھی شمار کیا جائے تو ایک ماہ میں چار فرد ہو گئے۔ چار فرد سے حاصل ہونے والی رقم اسی ہزار روپے بنتی ہے۔ اگر ہر قسم کے اخراجات، ویزا ایجنٹ کو دی جانے والی ادائیگی اور مختلف دفتروں کے چکروں میں خرچ ہونے والی رقم کا تخمینہ تیس ہزار بھی جوڑا جاتا تو مقتول کو پچاس ہزار روپے ماہانہ کی بچت ہو رہی تھی اور یہ بڑی شاندار اور قابلِ توجہ آمدنی تھی۔

ملزم نے مقتولہ کی اطراف دولت کی ریل پیل دیکھی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ظاہر ہے، اس نے اپنے بلیک میلنگ کے مطالبات کو بھی بلند کر دیا ہوگا۔ وقوعہ کے دن۔۔۔ سہ پہر مقتول اور ملزم کے مابین خاصی گرما گرمی ہوئی تھی۔ کیونکہ تھوڑی دیر پہلے مقتول نے تین کلائنٹس سے رقم وصول کی تھی۔ اس وقت تک بینک بند ہو چکے تھے اور اگلے ہی روز مذکورہ رقم بینک میں جمع کرائی جا سکتی تھی۔

چنانچہ ملزم نے اس موقع کو غنیمت جانا مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا اور رقم لے کر فرار ہو گیا۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔!

میں نے استغاثہ کی رپورٹ کو بڑی توجہ سے پڑھا اور اس میں مجھے تکنیکی نویت کی بعض خامیاں نظر آئی تھیں۔ مجھے امید تھی، عدالتی کارروائی کے دوران میں ان نکات کو اجاگر کر کے اپنے مؤکل کے لیے بہت آسانیاں حاصل کر لوں گا۔

اس پیشی پر میں نے خاص طور پر مقتول کے وارث رحمو نائی کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تگ ودو کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ ملزم کا باپ سردار بھٹی بھی متلاشی نظر سے رحمو کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ہم دونوں کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس نے رحمو نائی کے سلسلے میں سراسر غلط بیانی سے کام لیا تھا۔

اگر پولیس نے رحمو نائی کو پنڈی بھٹیاں سے بلایا ہوتا تو ہر قیمت

پر اسے عدالت میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال، سردار بھٹی سے پچاس ہزار روپے بٹورنے کی پولیس کی چال کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

استغاثہ کی رپورٹ میں مقتول شیدا نائی کے قتل کے علاوہ ساٹھ ہزار روپے کی چوری کا بھی ذکر تھا اور استغاثہ کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ رقم بھی میرے مؤکل ہی نے اڑائی ہے۔ یہ بات میرے اور سردار بھٹی کے لیے بالکل نئی تھی۔ میں نے تھانے جا کر جب ملزم سے ملاقات کی تو اس نے رقم کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

آئندہ پیشی پر اس کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی، ملزم نے میری ہدایت کے مطابق صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے کل چھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی جن میں زیادہ تر افراد کا تعلق اسی بلڈنگ سے تھا جہاں مقتول کا دفتر اور رہائش

تھی۔ میں ان میں سے صرف نہایت ہی اہم گواہوں کا احوال بیان
کروں گا۔

اس سے پہلے کہ استغاثہ کا کوئی گواہ بیان دینے کے لیے وٹنس باکس میں قدم رکھتا، میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ جج نے میری یہ فرمائش فوراً پوری کر دی۔ انکوائری آفیسر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے گواہ جیسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔

اس کیس کے انکوائری آفیسر کا نام شمشاد علی تھا اور وہ عہدے کے

اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔ پچھلی پیشی پر میں نے ملزم کے باپ سردار بھٹی سے اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ شمشاد علی وہ پولیس اہلکار نہیں تھا جس نے تھانے میں رحمونائی کے حوالے سے مک مکا کی بات کی تھی۔ سردار بھٹی کے مطابق وہ کوئی اے ایس آئی تھا۔

آئی۔ او (انکوائری آفیسر) وٹنس باکس میں آیا تو میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس کی عمر لگ بھگ پینتیس سال ہوگی۔ وہ صحت مند جسم کا مالک دراز قد شخص تھا۔ اس کے بدن کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسپورٹس مین۔۔۔خصوصاً تن ساز رہا ہے۔ اس نے ہلکی ہلکی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ایس۔آئی صاحب! متعلقہ جرح کی جانب بڑھنے سے پہلے میں آپ سے ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھنا چاہتا ہوں، اگر آپ کو کوئی

اعتراض نہ ہوتو۔۔۔؟''

''اگر آپ کے پوچھے گئے سوال میں اعتراض والی کوئی بات ہو گی تو میں ضرور اعتراض کروں گا''۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔''پوچھیں، آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''۔

میں نے پوچھا۔''آپ کی صحت کو دیکھ کر انداز ہوتا ہے کہ آپ بہت مستعد اسپورٹس مین رہے ہیں مثلاً ۔۔۔باڈی بلڈر یا ویٹ لفٹر؟''۔

''آپ کا اندازہ بڑی حد تک درست ہے''۔وہ فخریہ انداز میں سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔''میں باڈی بلڈنگ کرتا ہوں اور اپنے ویٹ میں تن سازی کے کئی مقابلے بھی جیت چکا ہوں''۔

''ویری گڈ۔۔۔!'میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

''آپ جس محکمے میں خدمات انجام دے رہے ہیں، اس میں

آپ کی تن سازی کی صلاحیت تو بہت کام آتی ہو گی۔ پلک جھپکتے میں آپ مجرم کو گردن سے پکڑ لیتے ہوں گے جیسا کہ آپ نے میرے مئوکل کو گرفتار کر لیا ہے۔ مد مقابل کو تو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملتا ہو گا!"۔

اپنی تعریف کسی کو بری نہیں لگتی، سب انسپکٹر شمشاد علی بھی خوش ہو گیا اور زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "بس جی اللہ کا احسان ہے۔ مجرم کو تو میں صورت دیکھتے ہی پہچان جاتا ہوں"۔

"آئی۔ او صاحب!" میں نے متعلقہ موضو کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے سوال کیا "آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے دی تھی؟"۔

فون کیا تھا؟''۔

''ہمارے روزنامچے کے مطابق صبح نو بجے فون موصول ہوا تھا''۔

''صبح نو بجے۔۔۔''میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''آٹھ نومبر کی صبح یا نو نومبر کی صبح؟''۔

''نو نومبر کی صبح!''اس نے جواب دیا۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول شیدا نائی کی موت آٹھ نومبر کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔'' میں نے انکوائری آفیسر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔''اور آپ کو اگلی صبح نو بجے اس واقعے کی اطلاع دی گئی۔یعنی مقتول کی موت کے دس، گیارہ گھنٹے بعد؟''۔

''جی ہاں۔۔۔یہی حقیقت ہے''۔

''اور آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''۔

''آدھے گھنٹے بعد۔۔۔ کم وبیش ساڑھے نو بجے۔''

''جس وقت آپ جائے وقوعہ پر پہنچے، وہاں کتنے افراد موجود تھے؟''۔

''فلیٹ کے اندر صرف مقتول کا ذاتی ملازم فرید حسین موجود تھا۔'' آئی۔او نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''دائیں بائیں کے دفاتر میں کام کرنے والے افراد باہر جمع تھے اور چہ مگوئیوں میں مصروف تھے''۔

''ٹھیک ہے۔۔۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔''آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد کیا کارروائی کی؟''۔

''موقع کی کارروائی۔۔۔'' اس نے بتایا۔''میں اپنے ساتھ دو

کانسٹیبلز بھی لے گیا تھا۔ ایک کانسٹیبل کو میں نے فلیٹ کے داخلی دروازے پر متعین کر دیا تا کہ کارروائی کے دوران کوئی شخص اندر داخل نہ ہو۔ دوسرا کانسٹیبل مختلف امور میں میرا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ ہم فرید حسین کی رہنمائی میں سیدھے اس بیڈروم میں پہنچے جہاں مقتول بیڈ پر مردہ پڑا تھا۔ کھوپڑی میں لگنے والی دو گولیوں نے اس کے سر کا کچومر نکال دیا تھا''۔

''ہوں۔۔۔'' میں نے تیز نظروں سے تفتیشی افسر کو گھورا اور کہا۔''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں آپ کم از کم دس گھنٹے بعد جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ آج کل موسم بھی خاصا سرد تھا۔ اس کا مطلب ہے، مقتول کے جسم سے خارج ہونے والا خون تو جم گیا ہو گا؟''۔

''جی ہاں، اس کا یہی مطلب ہے''۔ اس نے اثبات میں گردن

ہلائی۔ ''جب میں نے مقتول کی لاش کا معائنہ کیا تو وہ بیڈ پر اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا تاہم خون خشک ہو چکا تھا۔''

''آپ نے جائے وقوعہ سے فنگر پرنٹس بھی اٹھائے ہوں گے؟''۔

''جی ہاں، مقتول کے بیڈروم کے مختلف حصوں سے ایف۔ پی حاصل کیے گئے تھے''۔اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

''پھر، اس کارروائی سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوا؟''۔میں نے استفسار کیا۔

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔''اس بیڈروم سے ہمیں تین افراد کے ایف پی ملے تھے۔نمبر ایک، مقتول۔نمبر دو، فرید حسین۔نمبر تین، ملزم''۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔اس فلیٹ میں یہی تین افراد رہائش

پذیر تھے۔ مذکورہ فلیٹ تین کمروں پر مشتمل ہے۔ایک کمرہ دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور مقتول کا ذاتی ملازم فرید حسین اسی کمرے کے ایک صوفے پر سویا کرتا تھا۔

باقی وہ بیڈرومز میں سے ایک مقتول کا تھا۔ جب کہ دوسرے اور نسبتاً چھوٹے کمرے میں ملازم نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ مقتول جان سے گیا۔ اس فلیٹ میں رہائش پذیر زندہ بچ جانے والے دو افراد میں سے آپ نے میرے مؤکل کو نشانہ بنالیا۔۔۔ کیوں۔ کیا آپ نے اس سلسلے میں مقتول کے ذاتی ملازم فرید حسین کو چیک کرنے کی زحمت کی؟

''ہم نے فرید حسین اور خالد بھٹی دونوں کو مختلف زاویوں سے چیک کیا تھا''۔وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔

''حالات و واقعات کی روشنی میں ہمیں فرید حسین بے قصور اور

خالد بھٹی اس واردات میں پیش پیش نظر آیا لہذا وہ اس وقت اکیوزڈ
باکس میں کھڑا دکھائی دے رہا ہے"۔

''حالات وواقعات کی روشنی کیسے کیسے عجب مناظر دکھلائے گی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا''۔ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔''فی الحال، ہم آلہ قتل کی طرف آتے ہیں''۔ میں نے لمحاتی توقف کیا، ایک پرسکون سانس خارج کی اور سلسلہ جرح کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایس۔آئی صاحب! پوسٹ مارٹم رپورٹ کی رو سے مقتول کو سائیلنسر لگے ریوالور سے قتل کیا گیا تھا اور ایک اچھی خبری ہ بھی ہے

کہ آپ نے مذکورہ آلہ قتل برآمد کرلیا ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو اس بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟''۔

''آلہ قتل کے بارے میں استغاثہ کی رپورٹ میں سب کچھ تفصیلاً درج ہے۔ شاید آپ نے چالان کے مسودے کو توجہ سے پڑھا نہیں''۔اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بہرحال، میں بتا دیتا ہوں۔۔۔'' وہ لمحے بھر کے لیے ٹھہرا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آلہ قتل اعشاریہ تین دو کیلی بر کا ایک سائیلنسر لگا ریوالور تھا جس سے دو گولیاں۔۔۔دو بے آواز گولیاں فائر کی گئیں جنہوں نے مقتول کی کھوپڑی کو پاش پاش کر دیا اور اس کے نتیجے میں مقتول کی کھوپڑی کو پاش پاش کر دیا اور اس کے نتیجے میں مقتول کی موت واقع ہوگئی۔ پولیس نے خانہ تلاشی کے دوران مذکورہ ریوالور برآمد کرلیا۔

بس، یہ ہے آلہ قتل کی کل کہانی۔''

''پولیس نے۔۔۔ یعنی آپ نے خانہ تلاشی کے دوران سائیلنسر لگا ریوالور برآمد کرلیا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آلہ قتل مقتول کے فلیٹ کے کس حصے سے برآمد ہوا تھا؟''۔

''ڈسٹ بن سے'' اس نے ترنت جواب دیا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اور یہ ڈسٹ بن گھر کے اندر کس مقام پر رکھا تھا؟''

''داخلی دروازے کے باہر۔۔۔ گیلری کے کونے میں''۔ اس نے بتایا۔

''داخلی دروازے کے باہر۔۔۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یعنی فلیٹ کی رہائشی حدود سے باہر جبکہ آپ تھوڑی دیر پہلے

معزز عدالت کے روبہ رو یہ فرما چکے ہیں آلہ قتل خانہ تلاشی کے دوران برآمد ہوا تھا۔ خانہ کا مطلب تو آپ جانتے ہی ہوں گے سب انسپکٹر صاحب؟''۔

''بڑی اچھی طرح جانتا ہو وکیل صاحب!'' وہ جواباً تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''فلیٹ کے باہر کی گیلری اور کوریڈور چونکہ مقتول کے ہی استعمال میں تھے۔ اس لیے وہاں رکھا ہوا ڈسٹ بن کو اندر خانہ شمار کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ۔۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''بال کی کھال کھینچ رہے ہو!''۔

''آئی او صاحب! میں کوئی بھی کام خواہ مخواہ نہیں کرتا۔'' میں نے اپنے لہجے میں سنگینی بھرتے ہوئے کہا۔ ''بال کی کھال کیا شے ہے، میں تو موقع پڑنے پر کھال کے بال بھی کھینچ سکتا ہوں۔۔۔ بہر حال، میں وقتی طور پر آپ کے فلسفے ''اندر خانہ و باہر خانہ'' سے اتفاق کر لیتا

ہے''۔

آپ خوش ہو جائیں اور برہمی کو ایک طرف پھینک کر یہ بتائیں کہ آپ نے آلہ قتل کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھجوانے سے پہلے اس سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش کی تھی؟

''ظاہر ہے، یہ تو بہت ضروری تھا''۔ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

''پھر تو آپ نے آلہ قتل سے ملزم کی انگلیوں کے نشانات حاصل کر لیے ہوں گے؟''۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''نہیں جناب''۔ اس نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''آلہ قتل پر سے کسی کے بھی فنگر پرنٹس نہیں اٹھائے جا سکے۔ لگتا ہے، قاتل نے آلہ قتل کو ڈسٹ بن میں پھینکنے سے پہلے اچھی طرح صاف کر دیا

تھا‘‘۔

’’میں آپ کی بات سے صد فی صد اتفاق کرتا ہوں۔ آئی۔ او صاحب!‘‘ میں نے بڑے دوستانہ انداز میں اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ’’اگر پوسٹ مارٹم اور آلہ قتل کی لیبارٹری ٹیسٹ رپورٹ باہم یہ گواہی دیں کہ اسی ہتھیار سے مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور آلہ قتل پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات نہ پائے جائیں تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ چالاک قاتل نے آلہ قتل کو پھینکنے سے پہلے اچھی طرح صاف کر دیا ہوگا‘‘۔

آئی۔ او سمجھا کہ میں اس کی حمایت کر رہا ہوں۔ وہ خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ میں نے اس کی خوشی کے غبارے کو پنکچر کرنے کے لیے پن اٹھالی اور قدرے تیز لہجے میں سوال کیا۔

’’آئی۔ او صاحب! آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر خانہ تلاشی لی

تھی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، پچھلے کچھ دنوں سے ملزم خالد بھٹی، مقتول کے فلیٹ پر ہی قیام پذیر تھا۔ مذکورہ فلیٹ کے کل تین کمرے ہیں۔ ایک کمرے کو مقتول آفس کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ آفس سے ملحقہ نسبتاً بڑے کمرے کو اس نے اپنا بیڈروم بنا رکھا تھا جہاں اس کی خون آلود لاش پڑی ملی جبکہ تیسرے کمرے میں ملزم کا قیام تھا۔ کیا آپ نے مقتول کے فلیٹ کی خانہ تلاشی کے دوران ملزم کے کمرے کا جائزہ بھی لیا تھا؟"۔

وہ جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ "ملزم والا بیڈروم چونکہ مقتول کے فلیٹ کے اندر ہی واقع تھا۔ لہذا میں نے وہاں کی مکمل اور تفصیلی تلاشی لی تھی"۔

"آپ کو وہاں کوئی قابل اعتراض چیز نظر آئی؟"

"نہیں، ایسی کوئی شے مجھے اس کمرے میں دکھائی نہیں دی"۔

''تاثر۔۔'' اس نے لمحہ بھر سوچا پھر جواب دیا۔'' یہی تاثر ابھرتا تھا کہ اس بیڈروم میں کوئی انسان رہتا ہے اور اسے خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتا ہے''۔

''یعنی۔۔۔آپ نے اس بیڈروم کی ہر شے مثلاً بیڈ، وارڈروب اور سامان ضروریہ کو اچھی طرح چیک کیا تھا جس سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ وہ کمرا مکمل طور پر آباد ہے''۔

''آپ خوامخواہ گھما پھرا سوال نہ کریں، میرے کہنے کا وہی مطلب ہے جو نتیجہ آپ نے اخذ کیا ہے'' وہ ناراضگی بھرے انداز میں بولا۔'' وارڈروب میں ملزم کے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ الماری کے اوپر ایک چھوٹا، بھورے رنگ کا سوٹ کیس بھی نظر آرہا تھا۔ علاوہ ازیں استعمال کی دیگر چیزیں بھی بیڈروم میں موجود تھیں''۔

''بہت بہت شکریہ آئی او صاحب! میرے سوالات سے اگر آپ کو زحمت ہوئی تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں''۔ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے توقف کیا اور پھر پوچھا۔

''آلہ قتل۔۔۔سائیلنسر لگے اعشاریہ تین دو کیلی پر والے ریوالور کی ملکیت کا کچھ پتا چلا؟''۔

''جی ہاں۔۔۔آلہ قتل ایک لائسنس یافتہ ریوالور تھا جو مقتول کی ملکیت ثابت ہوا'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ! تو گویا۔۔۔گھر کو آگ لگ گئی، گھر کے چراغ سے!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے پوچھا۔

''مقتول شیدانائی کئی سال پہلے کراچی آیا تھا۔ اس نے اپنی اصلی شناخت کو ختم کر کے خود کو اے۔آر۔بھٹی بنا لیا تھا۔ آپ پر اس کی

اصلیت کا راز کیسے کھلا؟''۔

''یہ حقیقت ملزم کی زبانی ہمیں پتا چلی تھی''۔آئی۔او نے جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ ''استغاثہ نے آنکھیں بند کر کے ملزم کی بیان کردہ کہانی پر یقین کر لیا یا اپنے طور پر اس کی تصدیق بھی کی؟''۔

''جناب وکیل صاحب! ہم بات کی تصدیق کرنے کے بعد ہی کوئی عملی قدم اٹھاتے ہیں''۔ وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ''ہم نے ملزم کی زبان پر یقین کر کے مقتول کو عبدالرشید عرف شیدا نائی تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کے آبائی علاقے پنڈی بھٹیاں سے باقاعدہ انکوائری کرائی''۔

''آپ اس کام کے لیے پنڈی بھٹیاں پہنچ گئے!''

میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہاں کراچی میں مقتول کے بیوی بچے یا کوئی اور رشتے دار موجود نہیں تھا؟''۔

انکوائری آفیسر نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔'' مقتول نے شادی نہیں کی تھی، اس لیے بیوی بچوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں اس کا صرف ایک ہی رشتے دار زندہ بچا ہے اور وہ ہے اس کا سگا چچا رحم دین عرف رحمونائی جو ادھر پنڈی بھٹیاں میں رہتا ہے۔ ہم نے صرف اسی سے رابطہ کر کے اس امر کی تصدیق کی تھی''۔

''اوہ!'' میں نے متاملانہ انداز میں ایک گہری سانس خارج کی اور چونکے ہوئے لہجے میں جاننا چاہا۔ ''کہیں یہ وہی رحمونائی تو نہیں جو اس کیس کو رفع دفع کرنے کے لیے ملزم کے وارثوں سے مبلغ پچاس

ہزار روپے کا طلب گار تھا؟''۔

''جی، میں اسی رحمونائی کی بات کر رہا ہوں''۔ وہ بے دھیانی میں اقرار کر بیٹھا۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''اور آپ کے تھانے کے ایک اے ایس آئی نے رحمونائی کی ڈیمانڈ کو ملزم کے باپ سردار بھٹی کے سامنے بھی رکھا تھا لیکن اس نے ایسا کوئی بھی مطالبہ ماننے انکار کر دیا تھا، ہیں نا؟''۔

''پتا نہیں، آپ کیا الٹا سیدھا بول رہے ہیں!'' وہ سنبھالتے ہوئے والا۔ چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ ''ہم۔۔۔ ہم ایسے کسی معاملے میں۔۔۔ ملوث نہیں رہے۔۔۔ ہمارے تھانے میں ایسا کوئی۔۔۔ واقعہ پیش نہیں آیا۔۔۔ آپ خوامخواہ ہم پر الزام لگا رہے ہیں وکیل صاحب!''۔

بات ختم کر کے وہ پریشان نظروں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ سرد موسم کے باوجود بھی آئی۔ او کی پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔ اس کے متضاد بیان نے جج سمیت حاضرین عدالت کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اس پچویشن کا بھر فائدہ اٹھایا اور قدرے جارحانہ لہجے میں کہا۔

شمشاد علی صاحب! خدا کا خوف کریں۔ میں آپ پر قطعاً کوئی الزام نہیں لگا رہا بلکہ آپ کے بیان کو وضاحت سے پیش کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کے رو بہ رو اس بات کا اقرار کیا ہے، رحمونائی نے یہ کیس رفع دفع کرنے کے لیے ملزم کے وارثوں سے پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ ٹھیک ہے، میں آپ کی بات کو درست مان لیتا ہوں۔۔۔ کہ آپ کے تھانے میں کسی اے ایس آئی کے توسط سے رحمونائی کا ایسا کوئی مطالبہ ملزم کے باپ سردار بھٹی تک

نہیں پہنچایا گیا۔

آپ اور آپ کا تھانہ اس معاملے میں ملوث نہیں تو پھر بتائیں، آپ کو یہ کیسے پتا چلا کہ رحمونائی پچاس ہزار روپے کے عوض یہ کیس رفع دفع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟۔

''میں۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ۔۔۔ آپ کے سوال کے جواب میں بے دھیانی میں، میرے منہ سے نکل گیا تھا۔۔۔ جی ہاں، میں اسی رحمونائی کی بات کر رہا ہوں''۔ اس نے اپنے تئیں لیپا پوتی کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اٹ واز جسٹ اے سلپ آف ٹنگ۔۔۔!''

''انگلش میں اپنی غلطی کی وضاحت کرنے کا بہت بہت شکریہ آئی او صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ کو ہر لمحے اس بات کا احساس رہنا چاہیے کہ آپ

اس کیس کے ایک اہم کردار ہیں۔ آپ کی کسی کوتاہی سے کیس پر بڑے منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، خصوصاً میرے مئوکل اور اس کیس کے ملزم مسٹر خالد بھٹی پر'' میں نے لمحے بھر توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

آئی۔او جز بز ہو کر رہ گیا۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تاہم اس کے چہرے پر ابھرنے والے خجالت آمیز تاثرات اس بات کا کھلا اعلان کر رہے تھے کہ وہ اپنی غلطی پر خاصا پریشان اور الجھا ہوا ہے۔ میں نے اس کی پریشانی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آئی۔او صاحب! آپ کی محکمہ جاتی تفتیش و تحقیق کے مطابق رحمونائی۔۔۔مقتول کا اکلوتا رشتے دار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ رحمونائی کو اس کیس میں مدعی کی حیثیت حاصل ہے لیکن حیرت اس بات کی ہے کہ وہ شروع سے اب تک کسی بھی پیشی پر عدالت میں نظر

نہیں آیا۔ ایسا کیوں؟''۔

''اس کا ایک سبب ہے''۔ آئی۔ او تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے بلانے پر رحمونائی یہاں آیا ضرور تھا لیکن اس نے اس بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ یہ کہہ کر واپس چلا گیا تھا کہ ہم اس کیس کو اپنے طور پر جیسے چاہیں ہینڈل کریں۔ اسے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے''۔

''گویا اس کیس میں مدعی کے فرائض اب مکمل طور پر استغاثہ ہی کو ادا کرنے ہیں؟''۔ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ نے اپنی تفتیش کے نتیجے میں آلہ قتل کو تو برآمد کرلیا تھا لیکن استغاثہ کی رپورٹ میں کہیں ان ساٹھ ہزار روپوں کی برآمدگی کا ذکر نہیں ملتا جو میرے مؤکل

کے کھاتے میں ڈالے گئے ہیں۔ کیا آپ نے چوری شدہ رقم بازیاب نہیں کرائی؟"۔

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ملزم نے اس رقم کو بڑی ہوشیاری سے کہیں ٹھکانے لگا دیا!"۔

"ہوں۔۔۔!" میں نے محض ایک لفظ پر اکتفا کیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ "دی کورٹ از اِیڈجارنڈ!"۔

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہوں کے بیانات ہوئے۔ وکیل استغاثہ نے بھرپور اور میں نے سرسری انداز میں جرح کی۔ ان تین گواہوں کے نام علی الترتیب اکمل خان، پرویز بزمی اور فدا حسین تھے۔ اکمل خان اور پرویز بزمی کا وہاں بزنس تھا۔۔۔ یعنی مقتول جس بلڈنگ میں رہتا تھا، اس کے گراؤنڈ فلور پر ان کے دفاتر تھے جب کہ فدا حسین اس بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر رہائش پذیر تھا۔

وکیل استغاثہ نے ملزم کی ذات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ایک مخصوص زاویے سے جرح کی اور وہ زاویہ بالواسطہ یا بالواسطہ استغاثہ کی جزوی حمایت بھی جاتا تھا لیکن اس تمام تر جرح کے خلاصے میں کوئی بھی ایسا خطرناک پوائنٹ موجود نہیں تھا جو کسی مرحلے پر میرے مؤکل کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا۔ لہذا میں مطمئن تھا اور جانتا تھا کہ ان گواہوں کی شہادت خانہ پری سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔

میں نے گزشتہ پیشی پر اس کیس کے انکوائری آفیسر کو اپنی جرح کی چکی میں پیس ڈالا تھا۔ مختلف نازک مقامات پر اس نے بعض ایسی بیانی غلطیاں کیں جو استغاثہ کو کمزور کرنے کے ساتھ ہی میرے مؤکل کے لیے خاصی مفید ثابت ہونے والی تھی۔

اس کیس کو عدالت میں لگے اب چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ابتدائی چند پیشیاں تو تکنیکی امور میں گزر جاتی ہے اور باقاعدہ

عدالتی کارروائی عمل میں نہیں آتی، اسی لیے میں نے ان غیر دلچسپ کارروائیوں کا احوال بیان نہیں کیا۔

میرے مؤکل کا باپ ریٹائرڈ لانس نائیک سردار بھٹی ایک سمجھدار، بردبار اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ وہ میری اب تک کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن دکھائی دیتا تھا، اس دوران وہ دو چکر اپنے علاقے کے بھی لگا آیا تھا۔ میرے بتائے ہوئے دیسی نسخے نے اس کے سالے طفیل بھٹی کی تکلیف کو جادوئی انداز میں دور کر دیا تھا۔ وہ میرا بے حد شکر گزار تھا اور پچھلی مرتبہ جب سردار بھٹی پنڈی بھٹیاں سے لوٹا تو طفیل بھٹی نے اس کے ہاتھ میرے لیے کچھ تحائف بھی بھیجے تھے۔

جن میں ایک کاٹن سوٹ، اصلی دیسی گھی، کاغذی باداموں کی ایک صحت مند تھیلی اور شہد کی ایک بڑی بوتل شامل تھی۔ میں نے طفیل

بھٹی کی محبت کی قدر اور اس کے دلی جذبات کا احساس کرتے ہوئے تحائف خوشی سے قبول کر لیے تھے۔

سردار بھٹی نے اور بعد ازاں خالد بھٹی نے مجھے جو مفید معلومات فراہم کیں، میں ان کی روشنی میں قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا خاص طور پر خالد بھٹی نے جو لگ بھگ ایک ماہ مقتول کے فلیٹ پر گزارا تھا، اس دوران ہونے والے اس کے تجربات اور مشاہدات بڑی اہمیت کے حامل تھے۔

ان میں سے میں بعض پوائنٹس کی مار انکوائری آفیسر کو مار چکا تھا اور باقی میزائل میں نے استغاثہ کی سب سے اہم اور آخری گواہ مسٹر فرید حسین کے لیے بچا رکھے تھے۔ میری نظر میں فرید حسین کی ذات صاف و شفاف نہیں تھی۔ اگر میں اس پر کڑی جرح کرتا تو مجھے پوری امید تھی کہ اس کیس کی کوئی شکل ضرور نکل کر سامنے آ جاتی۔

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہی کے لیے وٹنس باکس میں فرید حسین کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق فرید حسین استغاثہ کا آخری گواہ تھا۔ لہذا میں اس کی گھسائی اور منجھائی کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ فرید حسین مقتول کا گھریلو ملازم بھی تھا جو مقتول کے لیے کل وقتی خدمات انجام دیتا تھا اور اس کی رہائش مستقل طور پر مقتول کے گھر ہی میں تھی۔

فرید حسین کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ وہ مائل بہ فربہی بدن کا ایک درمیانہ قد شخص تھا۔

فرید حسین نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے قریب چلا گیا۔ فرید حسین چونکہ استغاثہ کا گواہ تھا لہذا وکیل استغاثہ کا رویہ اس کے ساتھ خاصا دوستانہ تھا۔ اس نے سوالات کا سلسلہ آغاز کرتے ہوئے

پوچھا۔

''فرید صاحب! آپ ملزم کے بارے میں کیا کہیں گے؟''۔

گواہ نے ایکوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔''اس شخص سے میرا زیادہ واسطہ تو نہیں رہا لیکن مختصر سے عرصے کے دوران ہی میں نے اسے خاصا سازشی اور جھگڑالو پایا تھا۔اس کی چال کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے''۔

آخری جملہ اس نے بڑے تیکھے انداز میں ادا کیا تھا۔وکیل استغاثہ نے پوچھا۔''ملزم وقوعہ سے لگ بھگ ایک ماہ پہلے منظر عام پر آیا تھا۔کیا آپ نے اس سے پہلے کبھی اسے کہیں دیکھا تھا؟''۔

استغاثہ کے گواہ نے نفی میں گردن ہلادی۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔''جیسا کہ آپ نے بتایا ہے کہ ملزم کو آپ نے سازشی اور چال باز شخص پایا تھا۔واقعات وشواہد بتاتے ہیں کہ ملزم

اور مقتول کے درمیان کسی حوالے سے اندر ہی اندر کھچڑی سی پک رہی تھی۔ یہ کھچڑی مخالفت کی تھی۔ گویا کسی طوفان کی آمد آمد تھی۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ ان دونوں میں کس سلسلے میں تناؤ چل رہا تھا؟''۔

''دیکھیں جی، مجھے مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے''۔ فرید حسین نے حد سے زیادہ سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک اتفاق ہے کہ میں نے ایک روز ان دونوں کو کسی معاملے پر الجھتے ہوئے سن لیا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ کسی خاص حوالے سے ملزم بھٹی صاحب کو بلیک میل کر رہا تھا''۔

''کیا آپ کو اس خاص معاملے کی خبر نہیں تھی؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''اس وقت تو نہیں تھی جناب!'' گواہ نے نفی میں گردن ہلاتے

ہوئے جواب دیا ''لیکن اب تو ساری بات کھل چکی ہے۔ بھٹی صاحب شیدانائی تھے یا اے۔ آر بھٹی، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں جناب۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ میں ان کا ادنیٰ سا ملازم تھا لیکن وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ ان کی موت کا سب سے زیادہ دکھ مجھے ہوا ہے وکیل صاحب!''۔

’’وقوعہ کے روز مقتول نے تین کلائنٹس سے رقم وصول کی تھی‘‘۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔’’یہ بات تو تمہارے علم میں ہوگی؟‘‘۔

’’جی ہاں!‘‘ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

’’اگرچہ بھٹی صاحب نے تو مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن رقم دینے والوں سے میری بات ہوئی تھی‘‘۔ کچھ دیر رک کر وہ پھر بتانے لگا۔

’’وہ جناب! بات دراصل یہ ہے کہ بھٹی صاحب کے کمرے میں

تو لوگ ایک ایک کر کے جاتے تھے۔ باقی انتظار گاہ میں میرے پاس بیٹھتے تھے لہذا مجھے ان سے گپ شپ کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس روز میری اکرم، شہباز اور امتیاز سے خاصی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ اکرم کا تعلق گجرات سے جب کہ شہباز کا تعلق ساہیوال سے ہے اور وہ دونوں سعودی عرب جانا چاہتے تھے۔

امتیاز ادھر کراچی ہی کا رہنے والا ہے اور وہ مسقط جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ انہوں نے وقوعہ کے روز بیس ہزار کے حساب سے بھٹی صاحب کو کل ساٹھ ہزار روپے دیے تھے"۔

"اور وقوعہ ہی کے روز ملزم اور مقتول کے درمیان جھگڑا بھی ہوا تھا؟"۔ وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"بالکل جھگڑا ہوا تھا جناب!" وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔ "اس وقت سہ پہر کے تقریبا پانچ بجے تھے۔ وہ دونوں دفتر کے اندر بیٹھے

تھے اور میں باہر انتظار گاہ میں موجود تھے۔ مجھے یہ تو پتا نہیں کہ وہ کس مسئلے پر لڑائی کر رہے تھے تاہم اس گرما گرمی سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے درمیان کوئی سنگین مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے"۔

"پھر اس جھگڑے کا نتیجہ کیا برآمد ہوا تھا؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "آپ تو دفتر کے باہر انتظار گاہ میں موجود تھے۔ نتیجہ آپ سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا!"۔

انتظار گاہ سے وکیل استغاثہ اور فرید حسین کی مراد فلیٹ کا وہ حصہ تھا جو داخلی دروازے اور آفس کے درمیان واقع تھا۔ یہ درحقیقت فلیٹ کا لاؤنج تھا جسے مقتول نے وزیٹرز لابی کی شکل دے رکھی تھی، کلائنٹس کے لیے وہاں دو صوفے ڈال دیے گئے تھے۔ فرید حسین عموماً وہیں موجود ہوتا تھا اور انتظار گاہ میں بیٹھے بیرون ملک جانے کے امیدواروں سے گپ شپ کرتا رہتا تھا۔

گواہ نے وکیل استغاثہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''جناب! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس گرما گرمی کے نتیجے میں ملزم کمرے سے باہر نکلا اور غصے کے عالم میں وہاں سے رخصت ہوگیا''۔

''کہاں سے رخصت ہو گیا؟'' وکیل استغاثہ نے تفریح لینے والے انداز میں پوچھا۔

''اس دفتر سے۔۔۔یعنی اس فلیٹ سے۔۔۔'' استغاثہ کے گواہ نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے اس بات پر شدید حیرت بھی ہوئی کہ جب میں نے چلاتے ہوئے ملزم کو آواز دی تو اس نے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح وہاں سے رخصت ہوگیا''۔

''آپ نے یقیناً اپنی حیرت دور کرنے کی کوشش تو کی ہوگی''۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''مقتول سے یہ ضرور پوچھا ہوگا کہ آخر ایسی کیا بات ہوگئی جو ملزم یوں پاؤں پٹخ کر اور سر جھٹک کر چلا گیا؟''۔

''جی ہاں، میں نے اس بارے میں بھٹی صاحب سے پوچھا تھا''۔فرید حسین نے جواب دیا۔''اور انہوں نے بتایا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے''۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے۔کیا مطلب؟'' وکیل استغاثہ نے حیرت آمیز نظروں سے فرید حسین کو دیکھا۔

''آپ ذرا اس امر کی وضاحت تو کریں؟''

''جناب وکیل صاحب! بھٹی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ساٹھ ہزار کی رقم دیکھ کر خالد بھٹی کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔کہہ رہا تھا، یہ رقم میں اس کے حوالے کر دوں''۔فرید حسین نے گہری سنجیدگی سے بتانا شروع کیا۔''میں نے بھٹی صاحب سے پوچھا کہ وہ اتنی بھاری رقم کا

مطالبہ کس بنا پر کر رہا ہے؟''۔

بھٹی صاحب نے جواب دیا۔''وہ مجھے دھمکی دے رہا تھا کہ اگر میں نے اس کی کوئی بات نہ مانی تو وہ سب کو میری اصلیت کے بارے میں بتادے گا''۔

''آپ کی اصلیت کے بارے میں۔۔۔'' میں نے الجھن زدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا۔

انہوں نے کہا۔''ہاں، اس پاگل کا خیال ہے کہ میں اے۔آر۔ بھٹی نہیں ہوں''۔

''اگر آپ بھٹی صاحب نہیں ہیں تو پھر کیا ہیں؟''۔ میں نے متذبذب لہجے میں پوچھا۔

انہوں نے بتایا۔''یہ کمینہ مجھے ڈرا دھمکا کر بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہے''۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بھٹی صاحب!'' میں نے جوش بھرے لہجے میں ان سے کہا۔ ''اگر آپ کا حکم ہو تو میں اسے فلیٹ میں قدم بھی نہیں رکھنے دوں گا۔ یہ بندہ تو مجھے شروع ہی سے اچھا نہیں لگا تھا۔ آپ نے اپنی خوشی سے اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی' اس لیے میں خاموش رہا ورنہ۔۔۔''

''نہیں۔۔۔اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں''۔ بھٹی صاحب میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑے۔

''میں نے بڑے واضح الفاظ میں اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست کر لے۔ اس فلیٹ میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور۔۔۔ یہ بات بھی وہ اپنے ذہن سے جھٹک دے کہ میں اس کی کسی بلیک میلنگ میں نہ آؤں گا۔ مجھ سے وہ ایسی کوئی توقع نہ رکھے۔ یہ سنتے ہی وہ کہیں چلا گیا''۔

استغاثہ کا گواہ فرید حسین یہ من گھڑت کہانی سنا کر خاموش ہو گیا۔ اس کے بیان کو من گھڑت میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ خالد بھٹی کی زبانی مجھے جو حالات پتا چلے تھے، وہ اس کہانی سے مماثلت نہیں رکھتے تھے۔ وقوعہ کی سہ پہر خالد اور مقتول کے درمیان تھوڑی تلخ کلامی ضرور ہوئی تھی لیکن وہ کوئی اور ایشو تھا۔ مقتول کے چند ریکروٹنگ سے متعلق فراڈ میرے مئوکل کی نظر میں آ گئے تھے۔ یہ جان کر اسے بڑا افسوس ہوا تھا کہ مقتول بعض لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تگڑی تگڑی رقمیں بٹور رہا تھا۔

وہ جتنے افراد کو بیرون ملک بھجوانے کا آسرا دیتا تھا، ان میں سے آدھے تو گر پڑ کر باہر چلے جاتے تھے اور باقی نصف کی رقم مقتول کے پاس پھنس کر رہ جاتی تھی۔ وہ وعدے پر وعدے کر کے انہیں ٹالتا رہتا۔ یہ صورت حال ملزم کے لیے تکلیف دہ تھی۔ اس نے تلخ کلامی

کے بعد مقتول سے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ اگر اس نے بے ایمانی اور فراڈ کی روش ترک نہ کی تو وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ اس پر مقتول نے اس سے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے، وہ اپنا بندوبست کہیں اور کر لے اور یوں خالد مقتول کے دفتر سے نکل آیا تھا۔

گواہ کے خاموش ہونے پر وکیل استغاثہ نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''فرید صاحب! وقوعہ کی سہ پہر مقتول نے بڑی وضاحت کے ساتھ آپ کو ملزم کی برہمی اور بلیک میلنگ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ آپ معزز عدالت کو یہ بتائیں کہ ملزم کے رخصت ہونے کے بعد وہاں کیا حالات پیش آئے تھے؟''۔

''میں نے حسب معمول بھٹی صاحب کے لیے رات کے کھانے کا بندوبست کیا۔'' گواہ نے بتایا۔ ''رات کے کھانے کے بعد انہوں

نے چائے پی اور مجھ سے کہا کہ وہ تھک گئے ہیں، اس لیے اپنے بیڈ روم میں آرام کرنے جا رہے ہیں۔ وہ جب اپنے بیڈ روم میں داخل ہو گئے تو میں بھی لیٹ گیا تھا"۔

"آپ لیٹتے ہی سو گئے تھے یا دیر سے نیند آئی تھی؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"نیند کہاں آئی تھی جناب!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "مجھے صوفے پر لیٹے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ملازم واپس آ گیا۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا اور میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا کہ وہ اپنی رہائش کا بندوبست کر کے آ رہا ہے۔ وہ بھٹی صاحب سے چند باتیں کرے گا اور اپنا سامان لے کر چلا جائے گا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ واپس آیا اور تیز قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے فلیٹ سے نکل گیا۔ میں نے اس کی آمد اور رخصت کو زیادہ

اہمیت نہ دی اور فلیٹ کے داخلی دروازے کو بند کر کے دوبارہ لیٹ گیا پھر تھوڑی دیر کے بعد مجھے نیند آ گئی تھی‘‘۔

کسی بھی کیس میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت ملزم کی ہوتی ہے۔ اسے ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا ہوتا ہے اور وہ بھی بالکل چپ چاپ۔ استغاثہ کی جانب سے اس کے لیے جتنا بھی زہر اگلا جائے، اسے خاموشی سے پینا پڑتا ہے۔ استغاثہ کے گواہ اس کی ذات کے حوالے سے لاکھ غلط بیانیاں کرتے رہیں مگر اسے اپنے دفاع یا حمایت میں زبان سے ایک لفظ ادا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کی طرف سے صرف اور صرف وکیل صفائی ہی بول سکتا یہ یا پھر صفائی کے گواہ اس کی بے گناہی ثابت کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایک آدھ مزید سوال کے بعد وکیل استغاثہ نے جرح ختم کر دی۔

اپنی باری پر میں نے جج سے اجازت حاصل کی اور وٹنس باکس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''فرید صاحب! کیا آپ کا تعلق کراچی ہی سے ہے؟''

''نہیں جناب، میں بنیادی طور پر حیدر آباد کا رہنے والا ہوں''۔

''حیدر آباد دکن یا۔۔۔!'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''میں اس حیدر آباد کی بات کر رہا ہوں جو کوٹری کے قریب واقع ہے، دریائے سندھ کے کنارے''۔

''ٹھیک ہے'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ مقتول کے پاس کتنے عرصے سے کام کر رہے تھے؟''

''لگ بھگ پانچ سال سے'' اس نے جواب دیا۔

''وقوعہ کے بارے میں آپ نے فون کر کے تھانے میں اطلاع

دی تھی‘‘۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’کیا آپ کے پاس تھانے کا نمبر موجود تھا؟‘‘۔

میں جان بوجھ کر ہلکے پھلکے اور غیر متعلقہ سوالات سے اسے اپنے لیے تیار کر رہا تھا کہ جب میں اس کی زبان سے کوئی راز اگلوانا چاہوں تو وہ بے دھیانی میں مارا جائے۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

’’تھانے کا نمبر مجھے تو معلوم نہیں تھا۔ میں نے پرویز بزمی کے دفتر سے پولیس کو فون کیا تھا‘‘۔

پرویز بزمی اور اکمل خان کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں موجود تھے اور ان کی شہاتیں پچھلی پیشی پر ہو چکی تھیں۔

میں نے فرید حسین پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ’’فرید صاحب! آپ نے نو نومبر کی صبح پرویز بزمی کے آفس سے ٹھیک نو بجے تھانے

فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی اور ساڑھے نو بجے پولیس نے موقع پر پہنچ کر کارروائی شروع کر دی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"۔

"نہیں جناب۔۔۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا"۔

میں نے پوچھا۔"فرید صاحب! آپ گزشتہ پانچ سال سے مقتول کے ہاں کل وقتی ملازم تھے اور آپ کی رہائش بھی اس کے فلیٹ میں تھی۔ آپ مقتول کے لیے ناشتے کا بندوبست کرتے، کھانے پینے کے معاملات دیکھتے اور اس کی چھوٹی بڑی ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ عموماً کھانا آپ گھر میں اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے اور اگر ضرورت محسوس ہوتی یا مقتول کی طرف سے کوئی فرمائش ہوتی تو آپ ہوٹل سے کھانا بھی لے آتے تھے۔۔۔"میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو

آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے اپنی خدمات کی بدولت مقتول کے گھر میں فرد کی حیثیت حاصل کرلی تھی وہ آپ کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا تھا اور چھوٹی بڑی بات آپ سے شیئر کرتا تھا جیسا کہ وقوعہ کے روز ہوا۔۔۔'' میں نے دوبارہ چھوٹا سا توقف کیا پھر دوستانہ انداز میں اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا۔

''وقوعہ کی سہ پہر یعنی آٹھ نومبر کو ملزم اور مقتول کے درمیان خاصی گرما گرمی ہوگئی تھی۔ جس کے نتیجے میں ملزم بھنائے ہوئے انداز میں دفتر سے باہر چلا گیا تھا۔ بعدازیں جب آپ نے مقتول سے اس واقعے سبب جاننا چاہا تو اس نے آپ کو سب کچھ بتادیا تھا۔ وہ آپ پر پورا بھروسا کرتا تھا۔ فرید صاحب۔۔۔! اگر میں ذرا سا غلط کہوں تو آپ فوراً مجھے ٹوک دیجیے گا''۔

''نہیں وکیل صاحب! آپ تو لفظ درست فرما رہے ہیں''۔

وہ جلدی سے بولا۔''یہی حقیقت تھی لیکن۔۔۔'' اس نے افسردگی سے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔''اب تو بھٹی صاحب ہی زندہ نہیں رہے''۔

میں نے جرح کے زاویے کو تبدیل کیا اور سوالات میں تیزی لاتے ہوئے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔''فرید صاحب! وقوعہ کی رات مقتول خاصی تھکن محسوس کرر ہا تھا۔آپ نے استغاثہ کے وکیل کو بتایا ہے کہ اس رات وہ کھانا کھاتے ہی اپنے بیڈروم میں چلا گیا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وقوعہ کی رات آپ نے مقتول کے لیے کتنے بجے کھانا لگایا تھا؟''۔

''میرا خیال ہے، اس وقت رات کے نو بج رہے تھے''۔اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔''کھانے اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد مقتول سونے کے لیے اپنے بیڈروم میں داخل ہو گیا تھا اور آپ آفس والے صوفے پر لیٹ گئے تھے۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے کہ مقتول کتنے بجے اپنے بیڈروم میں گیا تھا؟''۔

''ساڑھے نو بجے۔۔۔''

''اور چند منٹ کے بعد ملزم واپس آ گیا تھا؟''۔

''جی ہاں۔۔۔اس کی واپسی رات دس بجے ہوئی تھی''۔

''ملزم نے آپ کو بتایا تھا کہ اس نے اپنے لیے الگ رہائش کا بندوبست کرلیا ہے''۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔''وہ اپنا سامان لینے کے لیے واپس آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ مقتول سے چند باتیں کر کے ہمیشہ کے لیے وہاں سے چلا

جائے گا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"۔

"جی ہاں۔۔۔!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اور آپ کو ملازم کی روانگی کا اس وقت پتا چلا جب وہ فلیٹ سے رخصت ہو چکا تھا لہذا آپ نہیں دیکھ سکے کہ وہ کون کون سا سامان لے گیا تھا۔ ویسے انکوائری آفیسر کے مطابق تو وہ اس فلیٹ سے اپنا کوئی بھی سامان لے کر نہیں گیا تھا۔ جب سب انسپکٹر شمشاد علی نے اس کے بیڈ روم کا جائزہ لیا تو وہاں ہر شے جوں کی توں موجود تھی۔۔۔!" میں نے بدستور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔اس بات پر مجھے حیرت ہوئی تھی"۔

"آپ کو یہ حیرت کب ہوئی تھی؟"۔

"جج۔۔۔جی۔۔کیا مطلب۔۔؟" اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ’’مطلب یہ ہے کہ آپ کو ملزم کے سامان نہ لے جانے پر جو حیرت ہوئی تھی اس کا موقع کون سا تھا۔۔۔ رات کو ملزم کے رخصت ہوتے وقت یا پھر پولیس کی خانہ تلاشی کے وقت؟‘‘۔

’’جی۔۔۔ میں صبح کی بات کر رہا ہوں‘‘۔ وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’رات کو تو جب ملزم وہاں سے چلا گیا تو میں فلیٹ کا دروازہ بند کر کے واپس آفس والے صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ ملزم کے سامان کے بارے میں تو اس وقت انکشاف ہوا جب پولیس نے اس کے کمرے کی تلاشی لی‘‘۔

’’یعنی رات کو ملزم کے حوالے سے آپ کے اندر کوئی تجسس نہیں جاگا کہ وہ مقتول سے کیا باتیں کر کے گیا ہے؟‘‘۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ نے ملزم کو مقتول کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا اور جا کر آفس والے صوفے پر لیٹ گئے، ہیں نا؟''۔

''جی ہاں۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں''۔ وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''میں نے رات ملزم کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی، اس لیے اس کے حوالے سے میرے اندر کوئی تجسس پیدا نہیں ہوا تھا''۔

''چلیں، آپ ہی کی بات کو درست مان لیتے ہیں''۔

میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''ملزم کو پولیس نے کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟''۔

''یہ بندہ اگلی صبح خود ہی چل کر دفتر آ گیا تھا۔'' استغاثہ کے گواہ نے جواب دیا۔ ''جس وقت پولیس والے موقع کی کارروائی کر رہے تھے تو یہ وہاں پہنچا اور ایسا بن گیا جیسے وہاں پیش آنے والے حادثے سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ میں نے سب انسپکٹر صاحب کی توجہ اس کی

جانب مبذول کرائی اور انہیں بتایا کہ اسی شخص کے ہاتھوں بھٹی صاحب کا یہ حشر ہوا ہے۔ پولیس نے فوراً اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی۔ اس وقت دس بجے تھے"۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میرے مؤکل نے خود کو وقوعہ سے لا تعلق ظاہر کرنے کی اداکاری نہیں کی تھی بلکہ یہ حقیقت ہے کہ شیدانائی کے قتل اور ساٹھ ہزار روپے کے غبن سے اس بے چارے کا دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نو نومبر کی صبح دس بجے صبح جب خالد بھٹی مقتول کے فلیٹ پر پہنچا تو اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں قتل کی واردات ہو گئی ہے"۔

فرید حسین نے آنکھیں جھپکا کر مجھے دیکھا اور خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ "یہ تو آپ بڑی عجیب بات کر رہے ہیں!"۔

"جو بات سر دست عجیب نظر آ رہی ہے نا، وہ تھوڑی دیر کے بعد

غریب بھی بھی ہونے والی ہے مسٹر فرید!" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔" پھر یہ عجیب وغریب صورتحال کسی کو بہت ہی غریب اور لاچار کر دے گی۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا مسٹر فرید؟"۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔" وکیل صاحب! پتا نہیں، آپ کس قسم کی معنی خیز باتیں کر رہے ہیں۔۔۔!"

جج سمیت تمام حاضرین عدالت بشمول وکیل استغاثہ اور تفتیشی افسر سانس روک کر استغاثہ کے گواہ پر ہونے والی جرح کا نظارہ کر رہے تھے۔ یہ نظارہ فی الحال بڑا محظوظ کرنے والا اور دل خوش کر دینے والا تھا لیکن آگے چل کر یہی نظارہ استغاثہ اینڈ کمپنی کے لیے خطرناک اور تکلیف دہ ثابت ہونے والا تھا۔ میں نے گواہ کی الجھن کو سلجھن میں بدلنے کے لیے "آپ" سے "تم" تک کا سفر ایک لمحے میں طے

کرلیا اور گھمبیر انداز میں کہا۔

''فرید حسین! میری معنی خیز باتوں کے معانی بس اب کھلنے ہی والے ہیں تم توجہ سے مجھے سنو اور بتاؤ کہ جس وقت ملزم کو پولیس گرفتار کر رہی تھی، ان لمحات میں اس کا مئوقف کیا تھا؟''۔

''میں نے بتایا ہے نا جناب، یہ بالکل ان جان بن گیا تھا۔ اس نے پولیس سے کہا کہ وہ اپنا سامان لینے واہاں آیا ہے۔ وہ کسی دوسری جگہ اپنی رہائش کا بندوبست نہیں کر سکا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ واپس اپنے گاؤں پنڈی بھٹیاں چلا جائے گا۔ اس نے بھٹی صاحب کو پیش آنے والے حادثے سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا تھا''۔

''حالانکہ یہ تمہیں رات میں بتا چکا تھا کہ اس نے کہیں رہائش کا انتظام کرلیا ہے''۔ میں نے سہلانے والے انداز میں کہا۔''وہ رات دس بجے اپنا سامان اٹھانے مقتول کے فلیٹ پر پہنچا تھا پھر سامان لیے

بغیر خاموشی سے واپس چلا گیا۔۔۔ بالکل چوروں کی طرح، ہیں نا؟''۔

''واقعی!'' وہ میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔''اس کا رویہ میری سمجھ سے تو بالاتر ہے جناب!''

''بالاتر ہی نہیں۔۔۔ بلکہ زیریں تر بھی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔''جی۔۔میں سمجھا نہیں؟''

میں نے اس کے حیرت بھرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔فرید حسین! استغاثہ کے مطابق بہ الفاظ دیگر تمہارے مطابق بہ الفاظ دیگر تمہارے مطابق ملزم اور مقتول کے درمیان آٹھ نومبر کی سہ پہر شدید جھگڑا ہوا جس کے نتیجے میں ملزم ناراض ہو کر وہاں سے چلا گیا۔آپ کا خیال ہے،اس نے مقتول کے بیڈ روم میں

داخل ہو کر اس کو اسی کے سائیلنسر لگے ریوالور سے قتل کیا اور ساٹھ ہزار روپے سمیٹ کر رفو چکر ہو گیا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ مقتول شیدانائی کی موت آٹھ نومبر کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی یعنی جس وقت آپ کی بیان کردہ کہانی کی رو سے ملزم مقتول کے بیڈروم میں موجود تھا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر میرے سوال کا جواب دینا۔ میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ایک شخص جو رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان کسی کو قتل کر کے چوروں کی طرح خاموشی سے ساٹھ ہزار روپے اڑا کر رفو چکر ہو جائے، وہ اگلی صبح جائے وقوعہ کا رخ کیوں کرے گا جب کہ وہ اس بات کا اعلان بھی کر چکا ہو کہ اس نے اپنی رہائش کا الگ بندوبست

کر لیا ہے؟''۔

''یہ۔۔۔یہ تو آپ۔۔۔'' وہ اضطراری انداز میں میرے موکل کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ۔۔۔اسی سے پوچھیں''۔

''ٹھیک ہے، یہ بات میں اسی سے پوچھوں گا لیکن بعد میں''۔

میں نے اس کی بے خبری میں اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔''فی الحال تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ بات کس وقت پتا چلی کہ مقتول شیدا نائی تمہیں چھوڑ کر کسی اور ہی دنیا کی شہریت اختیار کر چکا ہے؟''۔

''اس افسوناک حقیقت کا مجھے اگلی صبح علم ہوا تھا''۔ اس نے جواب دیا۔

''اگلی صبح۔۔۔یعنی نونومبر کو؟''۔

''جی ہاں''اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔''صبح کتنے بجے؟''

''لگ بھگ ساڑھے آٹھ بجے''۔

''کیسے؟''

''میں عموماً صبح سات اور ساڑھے سات بجے کے درمیان اٹھ جاتا ہوں۔''وہ وضاحتی انداز میں بولا۔''جبکہ بھٹی صاحب کم وبیش آٹھ بجے بیدار ہوتے تھے۔ ناشتا ہم ساڑے آٹھ بجے کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد بھٹی صاحب اخبار وغیرہ پڑھنے میں مصروف ہو جاتے اور میں آفس کی ڈسٹنگ اور دیگر صفائی کے کام نمٹانے لگتا۔ بھٹی صاحب تیار ہو کر ٹھیک دس بجے دفتر میں بیٹھ جاتے تھے''۔

وہ چند لمحے کے لیے رکا تو میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ بھٹی

صاحب یعنی شیدانائی کے لیے ظاہر کی جانے والی اس کی عقیدت میں بناوٹی پن پایا جاتا تھا جیسے کوئی گن پوائنٹ پر اسے یہ اداکاری کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''نو نومبر کی صبح جب معمول کے مطابق بھٹی صاحب نہیں اٹھے تو مجھے تشویش ہوئی۔ ساڑھے آٹھ بج گئے تھے یعنی ناشتے کا وقت ہو گیا تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا لہٰذا میری تشویش بہت زیادہ بڑھ گئی۔''

میں نے سوچا کہ ان کے دروازے پر دستک دیتا ہوں۔ میں نے تین چار مرتبہ دستک دی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اب تو میری تشویش پریشانی میں بدل گئی۔ میں نے بیڈ روم کے دروازے کو دبا کر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ اندر سے بند ہے۔ میرا دھیان سلائیڈنگ ونڈو کی طرف چلا گیا۔ میں نے مذکورہ کھڑکی پر طبع آزمائی کی تو تھوڑی سی

کوشش کے بعد وہ پھسل گئی۔

اس طرح اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ میں بیڈ روم کے اندر جھانک سکوں۔ میں نے اندر جھانکا اور میری آنکھیں خوف کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ایک جھرجھری لے کر خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کی ہارر ایکٹنگ سے متاثر ہوئے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے مقتول کے بیڈ روم میں ایسا کیا دیکھ لیا تھا کہ تمہارے رونگٹے کھڑے ہو گئے؟''۔

''جناب!'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے بھٹی صاحب کو بیڈ پر مردہ پڑے پایا۔ ان کی لاش اپنے ہی خون میں لت پت پڑی تھی''۔

''یعنی سلائیڈنگ ونڈو کے خلا سے جھانکنے پر تمہیں پتا چل گیا کہ شیدانائی کی لاش اپنے ہی خون میں لت پت پڑی ہے؟'' میں نے تیز

نظروں سے اسے گھورا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔"ونڈو میں سے دیکھ کر تو مجھے اندازہ ہوا تھا پھر جب مذکورہ ونڈو کو کسی طرح کھول کر میں اندر داخل ہوا تو بھٹی صاحب کی کھوپڑی کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اب باقی نہیں رہے"۔

"پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

اس نے بتایا۔"میں فوراً بیڈ روم سے باہر نکل آیا"۔

"اسی سلائیڈنگ ونڈو کے راستے؟"۔

"نہیں، میں نے بیڈ روم کے دروازے کی کنڈی کھول لی تھی"۔ اس نے جواب دیا۔

"پھر۔۔۔پھر تم نے مقتول کے بیڈ روم سے باہر نکل کر سب سے

پہلا کام کیا کیا؟''۔

''میں فلیٹ سے باہر نکل آیا۔'' اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''وہ صبح کا وقت تھا، اس لیے بلڈنگ میں واقع دیگر دفاتر ابھی کھلے نہیں تھے۔ فوراً میرے ذہن میں آیا کہ میں گراؤنڈ فلور پر جاؤں۔ وہاں پرویز بزمی کا آفس کھلا ہوگا۔ بزمی صاحب ٹائم کے بڑے پابند ہیں۔ ٹھیک آٹھ بجے وہ اپنی سیٹ پر موجود ہوتے ہیں۔ تو جناب! میں نے بزمی صاحب کے آفس سے لگ بھگ نو بجے تھانے فون کیا اور ساڑھے نو بجے پولیس فلیٹ پر موجود تھی''۔

''ٹھیک ہے۔۔۔ اچھی کہانی ہے؟'' وہ وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''میرے سوالات کے جواب دیتے دیتے تمہیں اپنے تمام سوالات کے جوابات خود بہ خود مل جائیں گے''۔

وہ بدستور الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اس کی الجھن کی پرواہ کیے بغیر پوچھا۔ ''رات کو ملزم کے فلیٹ سے چلے جانے کے بعد تمہیں کسی قسم کا تجسس محسوس نہیں ہوا۔ اگلی صبح جب تم سلائیڈنگ ونڈو کے راستے مقتول کے بیڈروم میں داخل ہوئے تو اس کی کھوپڑی کا حشر نشر ہو چکا تھا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، ملزم کی رخصت سے لے کر صبح آٹھ بجے کے دوران۔۔۔ اس فلیٹ میں کوئی اور شخص بھی آیا تھا؟''۔

''جی نہیں۔۔۔ بالکل نہیں''۔ وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔

''گویا وہ رات تم نے ایک لاش کے ساتھ اس فلیٹ میں گزاری تھی؟''۔

''لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ بھٹی صاحب کو قتل کر دیا گیا ہے!'' وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہیں

حقیقت کا پتا تھا یا نہیں۔۔۔ یہ سچ ہے کہ تم نے وہ رات ایک لاش کے

ساتھ گزاری تھی۔ بڑا حوصلہ ہے تمہارا مسٹر فرید!''۔

وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''جناب! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے

اس بات کا بالکل پتا نہیں تھا کہ بھٹی صاحب کو موت کے گھاٹ اتارا جا

چکا ہے''۔

''اگر میں یہ کہوں کہ تمہیں شیدا نائی کی موت کی خبر تھی تو؟''۔

''جناب۔۔۔ آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔!'' وہ شکستہ

لہجے میں بولا۔ ''میں۔۔۔ میں۔۔۔''

اس کی بات کاٹتے ہوئے میں نے سنسنی خیز لہجے میں دریافت

کیا۔ ''فرید! تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو یا یہ تمہارا پہلا جرم ہے؟''۔

''جی۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں''۔ وہ ہکا بکا سا ہو کر مجھے

دیکھنے لگا۔ ''جناب! میں نے کوئی جرم نہیں کیا اور نہ ہی۔۔۔''

''اس کا مطلب ہے، تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟''۔ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

''جناب! میں نے یہ بھی نہیں کہا۔۔۔!''

''تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو اور نہ ہی تم نے کوئی جرم کیا ہے''۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر واقعی ایسا ہے تو پھر تمہیں میرے ایک سوال کا جواب دینا ہو گا لیکن بہت سوچ سمجھ کر۔۔۔!''

اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی گردن کو سہلانا شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کا حلق خشک ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''فرید حسین وقوعہ کی رات ملزم کے فلیٹ سے نکل جانے کے بعد تم نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ مقتول کے پاس جا کر ملزم کی آمد اور اغراض و مقاصد کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے۔ تم نے فلیٹ کا بیرونی دروازہ بند کیا اور آفس میں آ کر سو گئے پھر اگلی صبح ہی تمہاری آنکھ کھلی۔ تم نے یہی بیان دیا ہے نا؟''۔

''جی ہاں، میں نے اپنے بیان میں یہی کہا ہے'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''اگلی صبح جب مقتول حسبِ معمول بیدار نہیں ہوا تو تم گہری تشویش میں مبتلا ہو گئے اور تم نے اس کے بیڈ روم میں جا کر صورتحال جاننے کا فیصلہ کیا لیکن بیڈ روم کے دروازے کو اندر سے بند پایا چنانچہ تم سلائیڈنگ ونڈو کو کھسکا کر بیڈ روم کے اندر پہنچے اور پھر تمہیں پتا چلا کہ مقتول کو سر میں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ تم

وحشت کے عالم میں دروازے کی کنڈی کھول کر بیڈروم سے باہر نکل آئے اور گراؤنڈ فلور پر جا کر تم نے پرویز بزمی کے آفس سے پولیس کو فون کر دیا۔ میں نے حقیقت حال بتانے میں کوئی غلطی کی ہو یا کوئی اہم نکتہ بیان ہونے سے رہ گیا ہو تو بتا دو؟''

''نہیں جناب۔۔۔'' وہ متاملانہ لہجے میں بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک جا رہے ہیں''۔

''اگر میں بالکل ٹھیک جا رہا ہوں تو تم پر بھی لازم ہے کہ میرے سوال کے جواب میں تم پٹڑی سے نیچے نہ اترنا اور میں جو کچھ بھی پوچھوں، سچ سچ بتانا؟''۔

''جی۔۔۔ جی پوچھیں؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''فرید حسین! وقوعہ کی رات لگ بھگ سوا دس بجے جب ملزم مقتول کے فلیٹ سے رخصت ہو گیا تو پھر مقتول کے بیڈ

روم کے دروازے کو اندر سے کنڈی کس نے لگائی تھی؟‘‘

اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا کر رہ گیا۔۔ بے حد نروس انداز میں اس نے بے ساختہ کہا’’مم۔۔۔مجھے۔۔۔کیا پتا جی۔۔۔ میں تو سو گیا تھا جناب‘‘۔

’’تم سو گئے تھے‘‘۔میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

’’تمہارے اور استغاثہ کے مطابق ملزم سائیلنسر لگے ریوالور سے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار کر فلیٹ سے نکل گیا تھا۔ باقی با مقتول شیدانائی۔۔۔!‘‘میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ میرے مؤکل نے مقتول کی کھوپڑی میں دو خاموش گولیاں اتار کر اسے قید حیات سے آزاد کر دیا تھا تو پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ ملزم نے رخصت ہو جانے کے بعد ایک مردہ شخص

اٹھ کر دروازے کو اندر سے کنڈی لگائے۔۔۔اور اگر یہ کنڈی مقتول شیدانائی ہی نے لگائی تھی تو پھر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جب ملزم، مقتول کے فلیٹ سے رخصت ہوا تو مقتول زندہ سلامت تھا۔شیدانائی کی موت ملزم کے جانے کے بعد واقع ہوئی تھی۔اس وقت جب فلیٹ میں صرف دو افراد موجود تھے۔یعنی تم اور مقتول۔۔۔اب تم ہی بتاؤ، مقتول کی موت کب، کیسے اور کس کے ہاتھوں واقع ہوئی تھی؟''۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔میں نے بڑے غیر محسوس طریقے سے جرح کی مدد سے گھیر گھار کر اسے ایک تاریک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا۔اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ بچا تھا اور نہ ہی بچاؤ کی کوئی راہ اسے دکھائی دے رہی تھی۔

حالات کی اسی تاریکی میں ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے اس نے اپنے تئیں بڑی عقل کی بات کی۔ پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''جناب۔۔۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے، بھٹی صاحب نے ملزم کے جانے کے بعد دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور خودکشی کر لی۔۔۔!''

''ونڈرفل۔۔۔ بہت خوب!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''اگر ایسا ہوجائے تو کیا کہنے۔۔۔ اس طرح تو میرا مئوکل، شیدا نائی کے قتل کے الزام سے آپوں آپ بری ہوجائے گا لیکن افسوس کہ ایسا ہونہیں سکتا۔۔۔!''

''کیوں نہیں ہوسکتا۔۔۔؟'' وہ میری بات کو سمجھے بغیر جلدی سے بولا۔'' بھٹی صاحب نے خودکشی نہیں کی ہوگی یا آپ کے مئوکل کے

بری ہونے کا امکان نہیں؟''۔

مجھ سے اس نوعیت کا استفسار کر کے گویا اس نے اوکھلی میں سر دے دیا تھا۔ میں نے کہا۔

''فرید حسین! میں اپنے مؤکل کو تو ہر قیمت پر قتل کے اس الزام سے باعزت بری کروا ہی لوں گا لیکن مجھے اس کیس میں تمہاری گردن پھنستی نظر آ رہی ہے!''

''م۔۔۔میری گردن۔۔۔!'' وہ بڑے خوف زدہ انداز میں اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''م۔۔مگر کیوں۔۔۔؟''۔

''مگر۔۔۔اس لیے کہ تمہارے بھٹی صاحب اور میرے بھٹی صاحب اور میرے شیدا نائی قطعاً خودکشی نہیں کی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ۔۔۔ یہ بات اتنے یقین سے۔۔۔کیسے کہہ سکتے

ہیں؟''۔

''اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی شخص اپنی کھوپڑی کے پرخچے اڑانے کے بعد اس قابل نہیں رہتا کہ اپنے بیڈروم سے باہر نکلے اور فلیٹ کے باہر رکھی ڈسٹ بن میں آلہ قتل کو پھینک سکے اور پھر چپ چاپ چلتے ہوئے وہ اپنے بیڈ پر آ کر لیٹ جائے اس طرح کہ فلیٹ کے کسی حصے میں اس نقل وحرکت کے نتیجے میں خون کا کوئی دھبا دکھائی نہ دے؟''۔

اتنا کہہ کر میں نے انکوائری آفیسر کی جانب رخ پھیرا اور تصدیقی لہجے میں استفسار کیا۔''آپ نے آلہ قتل کو ڈسٹ بن میں سے برآمد کرنے کے بارے میں تو بتایا تھا لیکن وہ خون کے دھبے۔۔۔؟''

''فرید کا دماغ خراب ہو گیا ہے''۔میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تفتیشی افسر نے جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔''یہ خودکا کیس

نہیں بلکہ قتل کی واردات ہے"۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں زبان کو زحمت دیتا، ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ استغاثہ کا گواہ فرید حسین کٹہرے کی ریلنگ کو تھامے تھامے زمین پر بیٹھ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اسے بہت زور کا چکر آ گیا ہے۔ میں نے اس کی خرابی صحت کی پرواہ کیے بغیر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! صورتحال روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے۔ استغاثہ کے سب سے اہم گواہ فرید حسین کو آنے والے چکر کا سبب وہ تصور ہے جس میں اس نے جیل کی سلاخیں اپنا مقدر ہوتے دیکھ لی ہیں۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ فرید حسین کو شامل تفتیش کر کے یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ شیدا نائی کو کس نے قتل کیا تھا۔ میرا مئوکل اس سلسلے میں قطعی بے گناہ ہے۔ حالات و واقعات کی

روشنی میں وہ بے گناہ ثابت ہو چکا ہے۔ اگر پولیس فرید حسین پر سختی کرے تو وہ بتانے پر مجبور ہو جائے گا کہ قاتل کون ہے۔۔۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر قتل اس نے نہیں کیا تو وہ قاتل کو جانتا ضرور ہے۔ دیٹس آل یور آنرز!"۔

وکیل استغاثہ کے پاس کسی اعتراض کی گنجائش نہیں بچی تھی لہذا جج نے میری فرمائش پوری کرتے ہوئے متعلقہ عدالتی عملے، وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کو خاص ہدایات دے دیں۔

گزشتہ پیشی پر میں نے اپنے مئوکل خالد بھٹی کو بے قصور اور شیدا نائی مرڈر کیس سے غیر متعلق ثابت کر دیا تھا۔ لیکن اس وقت تو خالد بھٹی کی بے گناہی پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی جب پولیس کی کسٹڈی میں فرید حسین کی چین بول گئی۔ وہ ان کی خاطر مدارات کو ہضم نہ کر سکا اور اس نے بڑی شرافت سے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ساٹھ ہزار روپے کی خرد برد کو بھی تسلیم کر لیا۔

فرید حسین کے اقبال جرم کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں
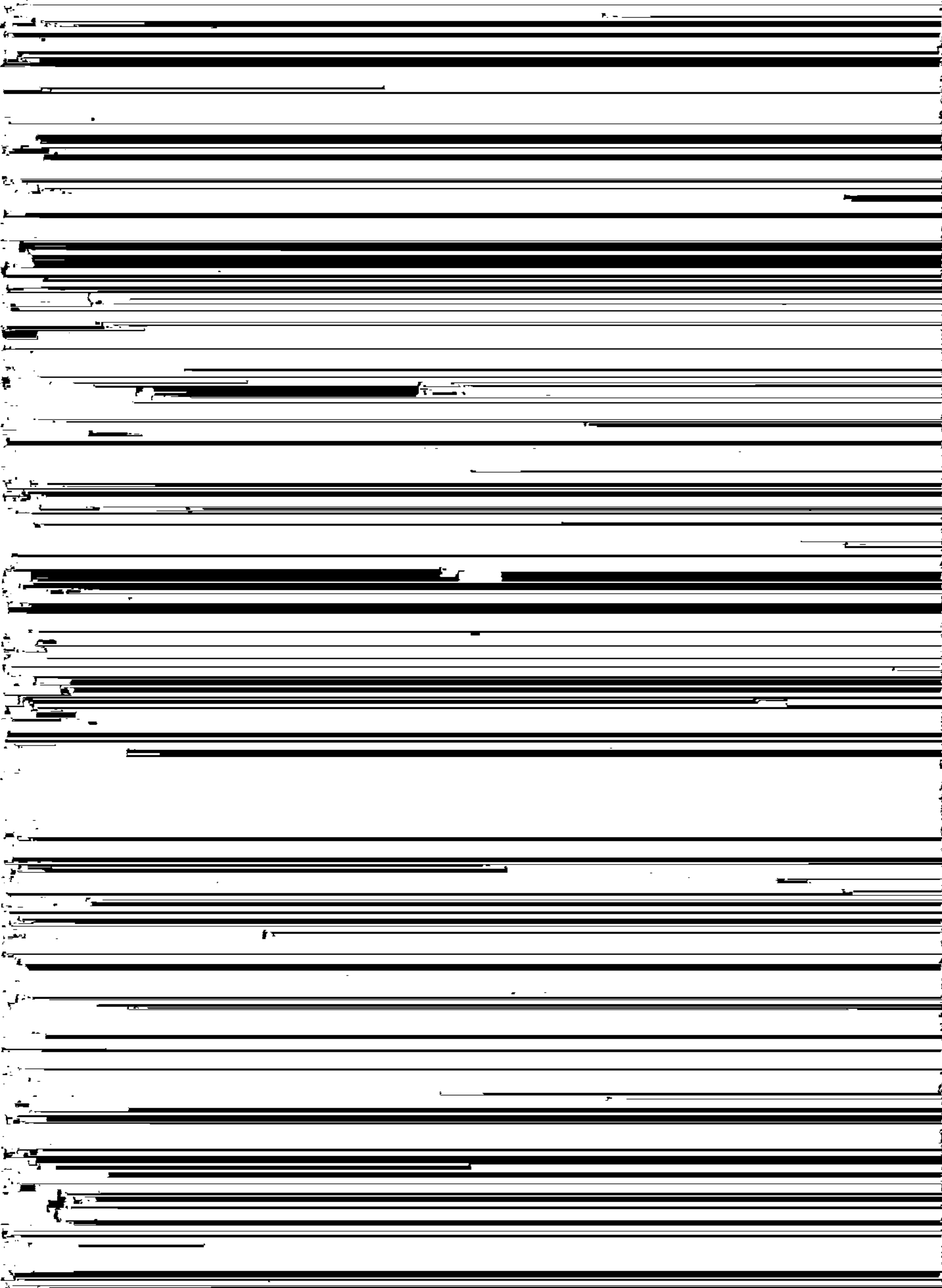
تعجب خیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں بزرگو۔۔۔آپ کس حوالے سے میرے فین ہیں؟''۔

اس شخص نے زیرلب مسکراتے ہوئے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یوں سمجھیں کہ میں آپ کا شکرگزار فین ہوں''۔

مجھے الجھن میں مبتلا دیکھ کر سردار بھٹی نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''بیگ صاحب! یہ میرا ساالا طفیل بھٹی ہے۔ جس کے لیے آپ نے ایک دیسی نسخہ عنایت فرمایا تھا۔ یہ اپنے پاؤں پر چل کر پنڈی بھٹیاں سے کراچی پہنچا ہے۔ آپ کے نسخے نے اس کے گٹے گوڈے (ٹخنے اور گھٹنے) ایک دم جوان کر دیے ہیں''۔

مجھے مذاق سوجھا۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''بھٹی صاحب! آپ تو بڑی عجیب بات بتا رہے ہیں۔ اس نسخے کا یہ کرشمہ تو میرے علم میں تھا ہی نہیں کہ اس کے استعمال سے ہزار، ڈیڑھ ہزار میل پیدل

چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔''

''اوہ!'' سردار بھٹی خجالت آمیز انداز میں بولا۔

''میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ طفیل بھٹی اپنے پاؤں سے چلنے لگا ہے۔ پنڈی بھٹیاں سے کراچی آنے کے لیے تو اس نے ٹرین ہی میں سفر کیا ہے''۔

''اگر ٹرین کا ذریعہ یا کسی بھی سواری کا وسیلہ نہ ہوتا تو بھی پیدل چل کر کراچی ضرور آتا''۔ طفیل بھٹی نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''اور اس کی دو وجوہات ہیں''۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے خود ہی اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

''پہلی وجہ تو آپ سے ایک بھرپور ملاقات کی خواہش تھی اور دوسرا مقصد اپنی آنکھوں سے اس جوان کو رہا ہوتے دیکھنا تھا جواب بہت

جلد میرا داماد بننے والا ہے!''

''داماد۔۔۔آپ خالد بھٹی کی بات کرر ہے ہیں؟''۔

سردار بھٹی نے کہا۔''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں بیگ صاحب! طفیل بھٹی، اپنے خالد ہی کی بات کرر ہا ہے۔جس معاملے کی وجہ سے خالد دل برداشتہ ہوکر سعودی عرب چلا گیا تھا، وہ اللہ کے فضل وکرم سے حل ہوگیا ہے۔اب اس بات کا فیصلہ ہوگیا ہے کہ طفیل بھٹی کی بیٹی رخسانہ کی شادی خالد سے ہوگی''۔

میں نے خالد بھٹی کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے پر یک بہ یک مختلف نوعیت کے تاثرات اکٹھا ہوگئے تھے جن میں خوشی ومسرت کا تاثر سب سے نمایاں تھا۔

اس بات کا اندازہ لگانے میں مجھے قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ ان دونوں نے اپنے ''فیصلے'' سے خالد کو ابھی اور اسی وقت

آگاہ کیا تھا۔

میں نے خالد سے پوچھا۔ ''تم ہی بتاؤ، میں تمہیں مبارکباد دیتے ہوئے کس قسم کے الفاظ استعمال کروں۔۔۔نئی زندگی مبارک ہو، مصیبت سے نجات مبارک ہو، باعزت رہائی مبارک ہو یا۔۔۔شب وصال مبارک ہو۔۔''شب'' کا لفظ میں نے اس لیے چنا کہ تمہاری شادی کے موقع پر تو میں موجود نہیں ہوں گا لہذا میری جانب سے شادی کی پیشگی مبارک ہو''۔

''میں آپ کو اپنی شادی پر ضرور مدعو کروں گا بیگ صاحب!'' خالد بھٹی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس لیے ''شب وصال'' کی مبارک کو ابھی آپ اپنے پاس ہی محفوظ رکھیں''۔

''ٹھیک ہے، تمہاری ''شب وصال''۔۔۔میرا مطلب ہے، تمہاری شادی کی ''مبارکباد' میرے پاس امانت کے طور پر رکھی

ہے۔‘‘میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

ان تینوں کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔۔۔!

☆☆☆☆

ختم شد